سوانحی ادب سے متعلق ادارہ تحقیقات اسلامی کی تصانیف و تراجم
تبصرہ و تجزیہ

عصمت بتول ❁
وردہ یاسین ❁

تعارف

سوانح ادب کا تعلق شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کے احوالِ زندگی اور ان کی خدمات کو تحریری شکل میں محفوظ کر کے اگلی نسلوں تک منتقل کرنے سے ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس روایت کی بنیاد جناب رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور ان کے عہد کے احوال قلم بند کرنے سے پڑی۔ اس کے علاوہ مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے حالات محفوظ کیے گئے، جس کی وجہ سے لاکھوں رواۃ حدیث کے احوال پر مشتمل وقیع اور مستند علمی ذخیرہ وجود میں آیا، اور یہ سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے۔ عصر حاضر میں اس بابت ایک اہم رجحان یہ سامنے آیا ہے کہ کسی شخصیت سے متعلق کانفرنس کا اہتمام کر کے اس کی زندگی کے مختلف جہات پر محققین اپنے علمی مقالات پیش کریں اور بعد میں ان مقالات کو مرتب کیا جائے اسی طرح اس شخصیت کی زندگی کے تمام پہلو مفصل طور پر سامنے آجاتے ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کا تعلق بھی ادارہ تحقیقات سے سوانحی ادب سے متعلق شائع شدہ مطبوعات کے تجزیاتی مطالعہ سے ہے۔ ادارہ ہذا اس ضمن میں وقیع کتب منصۂ شہود پر لا چکا ہے، جن میں سے بعض کتب تراجم کی صورت میں چھپ چکی ہیں، جب کہ بعض کی حیثیت مجموعہ مقالات کی ہے۔ مقالے میں ان کتب کا تجزیہ اور تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

❁ لیکچرر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان۔

❁ اسسٹنٹ پروفیسر / صدر شعبہ قانون، فیکلٹی آف شریعہ اینڈ لا، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔
(warda.yasin@iiu.edu.pk)

تبصرہ اور تجزیہ کے دوران میں کتب کا تعارف، مندرجات اور اہم پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جب کہ اس کے ساتھ ساتھ اس شخصیت کا مختصر تعارف اور اس کی علمی وفنی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالے میں استقرائی، بیانی، اور وصفی منہج اختیار کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کے بعد جو مقام و مرتبہ حدیث رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ قرآن مجید کی طرح احادیث رسول ﷺ کا حجت ہونا بھی روایتاً ودرایتاً ثابت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی اطاعت پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ جس چیز کا آپؐ نے حکم دیا ہے اس پر عمل کیا جائے گا اور جس سے منع کیا ہے، اسے ترک کرنا ہو گا؛ اس لیے ائمہ میں سے کسی کا قول اگر صحیح حدیث کے خلاف ہو تو لازم ہے کہ ان کے پاس اس کو ترک کرنے کا کوئی عذر ہو۔ ابن تیمیہ نے اس باب میں اعذار کی تین اصناف کا ذکر کیا ہے۔ اوّلاً یہ کہ رسول اکرم ﷺ سے جو بات منسوب کی جارہی ہے آپ ﷺ نے وہ بات ہی نہ کی ہو۔ دوم یہ کہ اس بات پر اعتقاد ہونا کہ اس قول سے یہ مسئلہ مراد نہیں ہے (یعنی حدیث وارد ہے، لیکن مسئلہ سے متعلق نہیں ہے۔) اور سوم یہ کہ یہ اعتقاد ہونا کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ (۱)

مسلم علمی روایت میں حدیثِ نبویؐ کے کئی مجموعے مرتب کیے گئے جن میں سے ایک کتاب **مسند امام ابو حنیفہؒ** ہے۔ یہ کتاب خود امام ابو حنیفہؒ نے تصنیف نہیں کی بلکہ ان کے شاگردوں سے ہم تک منتقل ہوئی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا علمِ کتاب و سنت اور تفقّہ فی الدین میں خاص مقام تھا اور عوام الناس میں آپ کے علم کا اثر ورسوخ تھا۔ آپؒ جدید منہج استنباط و احکام کے بانی تھے۔ ابو زہرہ کے نزدیک مذہب ابو حنیفہ شرق و غرب میں پھیلا ہوا ہے جس کو مختلف علاقوں کے عوام الناس نے قبول کیا ہے۔ یہاں تک کہ عہد بنو عباس میں اور پھر خلافتِ عثمانیہ میں یہ مذہبِ رسمی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پھر جن اقالیم میں یہ مسلک پھیلا ہوا تھا وہاں کے لوگوں کے مسائل مختلف تھے۔ جن لوگوں نے ان مسائل کا مطالعہ کیا انھوں نے اس مذہب کو وسعت دی۔ اس میں مسئلہ کی تخریج آسان نہیں ہے۔ ہر مسئلے کا خاص عرف ہے اور ہر زمانے کے اصول و فروع کی تخریج کا انداز مختلف ہے۔ (۲) امت کے حفاظ نے امام صاحب کی مرویات کو جمع کرنے کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ ان مرویات کو مسانید کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ کسی بھی امام کے

۱۔ ابو نعیم احمد الاصبہانی، **مسند الإمام أبي حنيفة**، تحقیق، محمد عبد الرشید النعمانی (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۰ء)، ح۔

۲۔ محمد ابوزهرة، **أبو حنيفة حياته و عصرو آراؤه و فقهه** (قاهرة: دار الفكر العربي، ۱۹۶۰ء)، ہے۔

متبعین نے ان کی سند کی تصنیف اس طرح نہیں کی جس طرح امام ابو حنیفہؒ کے متبعین نے کی ہے۔ اس سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس فن میں دسترس کا پتا چلتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری امام ابو حنیفہؒ کی مسانید کی ہجری شمار ہوتی ہے۔

اس صدی میں امام صاحب کی تقریباً بارہ سے زائد مسانید مرتب کی گئیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ محدثین امام صاحب کو اس فن کے اعیان میں سمجھتے تھے۔[۳] جن کبار محدثین نے یہ مسانید لکھیں ان میں حافظ محمد بن مخلد بن حمض، حافظ ابن عقدہ، حافظ ابو القاسم، حافظ اشنائی، امام حارثی، حافظ ابن عدی صاحب الکامل، حافظ ابن شاہین، امام دار قطنی، ابن عساکر اور حافظ ابو نعیم احمد الأصبھانی وغیرہ شامل ہیں۔

زیر نظر مسند، امام ابی نعیم کی ہے۔ اس مسند کی اہمیت اس بات سے بڑھ جاتی ہے کہ امام ابی نعیم کبار شافعی حفاظ میں سے تھے اور فنِ درایت کے حافظ اور عالم تھے۔ اس کے باوجود کہ یہ مسند دیگر مسانید کے مقابلے میں حجم میں چھوٹی ہے، لیکن فوائد کے اعتبار سے اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہے، کیوں کہ اس میں متابعات، تفردات، اوھام اور رُواۃ وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر مفید معلومات تحریر کی گئی ہیں۔ یہ مسند اپنی تصنیف کے بعد کئی صدیوں تک پوشیدہ رہی، لہذا اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس پوشیدہ خزانے کو دنیا پر عیاں کیا جائے۔[۴] چناں چہ ڈاکٹر محمد عبد الشہید نعمانی نے اس کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی تحقیق و تخریج کی، جس کو باقاعدہ طور پر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد نے ۲۰۰۰م میں شائع کیا۔ یہ کتاب عربی زبان میں شائع ہوئی جو کل ۵۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

محقق نے اس بحث کو چھے ابواب اور نو فصول میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں مؤلف کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس کی پانچ فصلیں ہیں: پہلی فصل میں ان کے حالات زندگی جب کہ دوسری فصل میں ان کی علمی سرگرمی کا تذکرہ کیا ہے۔ تیسری فصل میں ان کا علمی مقام و مرتبہ اور ائمہ و اکابرین کے ان پر نقد اور تعریفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھی فصل میں مذہب میں ان کے اعتقادات اور فروعات جب کہ پانچویں فصل میں ان کی وفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ان کے شیوخ و تلامذہ سے متعلق ہے۔ فصل اول میں ان کے شیوخ اور فصل دوم میں ان کے تلامذہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ تیسرا باب ان کی علمی خدمات سے متعلق ہے۔ فصل اول میں ان کی تصانیف کا

۳۔ الأصبھانی، مصدرِ سابق، ۱۔

۴۔ نفس مصدر۔

ذکر کیا گیا ہے اور فصل دوم میں زیر نظر کتاب کی توصیف کے ساتھ ساتھ کتاب کا نام، اوراق کی تعداد اور اس نسخہ کی تحقیق میں آنے والی مشکلات اور اس نسخے پر جو سماعات ثبت کی ہیں ان کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسانید اور ان کی تعداد، ان کے جامعین کے نام اور ان علما کا ذکر بھی کیا ہے جنھوں نے اس کی شرح یا تلخیص کی ہے۔

پانچویں باب میں امام ابو حنیفہؒ کی زندگی کا مختصر تذکرہ اور علمِ حدیث میں ان کے مقام و مرتبے کو بیان کیا گیا ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں کتاب کا منہج تحقیق بیان کیا گیا ہے، (۵) جس میں انھوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے یہ نسخہ کس طرح حاصل کیا، پھر اس پر اعراب کس طرح لگائے اور تقسیم کس طرح کی۔ اس کے بعد محقق نے بھرپور کوشش کی کہ جس صورت میں مؤلف نے اس نسخے کو تحریر کیا ہے اسی کے مطابق تخریج پیش کی جائے۔ اس مخطوطے سے جو کچھ بھی مؤلف نے نقل کیا اس کو اصل مخطوطے سے موازنہ کیا۔ مؤلف نے اس کتاب میں حدیث کی سند کا مطالعہ پیش کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ کون سے مصادر میں یہ حدیث موجود ہے؛ خاص طور پر ان احادیث کو کتب ستہ، **المصنف** عبد الرزاق و ابن ابی شیبہ، **کتاب الآثار لأبي يوسف**، محمد بن حسن الشیبانی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر مسانید میں تلاش کیا گیا۔ ابو نعیم نے اس نسخے کے مقدمے میں اپنے جن شیوخ کا ذکر کیا ہے ان کا مختصر تعارف بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غریب کلمات کی شرح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ (۶) مصنف نے رموز و مصطلحات بھی کتاب میں درج کی ہیں۔ (۷) کتاب کے آخر میں قرآنی آیات، احادیث نبویہ، مسانید صحابہ، کتب فقہ، اماکن و بلدان، جماعات اور فِرَق، غریب الحدیث، ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ، ابو نعیمؒ کے اساتذہ، جرح و تعدیل، اقوال ابی حنیفہؒ وغیرہ کی فہارس بھی دی گئی ہیں جنھیں ادارہ تحقیقات اسلامی کے استاد ڈاکٹر عصمت اللہ نے مرتب کیا ہے۔ (۸)

الغرض زیرِ نظر تحقیق بیش قیمت علمی سرمایہ ہے۔ جس میں ابو نعیم الأصبہانی کے مخطوطے کی تحقیق بڑی دقت نظری سے کی گئی ہے۔

۵- نفس مصدر۔
۶- نفس مصدر۔
۷- نفس مصدر۔
۸- نفس مصدر۔

امام ابو حنیفہؒ: حیات، فکر اور خدمات

ترتیب و تدوین : محمد طاہر منصوری، عبد الحئی ابڑو

مطبع : ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

سن اشاعت : ۲۰۰۲ء

تعداد صفحات : ۲۱۳

اسلام کا قانونی نظام جملہ مکاتب فکر کے فقہا کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے اور اسی وجہ سے تمام فقہی مذاہب قابل احترام ہیں۔ حنفی فقہ ابتدا ہی سے ایک مقبول مکتبہ فکر رہا ہے۔ خلافت عباسیہ کے عہد میں عدالتی سطح پر اس کو پذیرائی ملی۔ سلطنت مغلیہ اور سلطنت عثمانیہ کا سرکاری مذہب بھی حنفی فقہ تھا۔ اس وقت بھی پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں حنفی فقہ رائج ہے۔ اس کی شہرت کی ایک بڑی وجہ تو اس کی وسعت اور جامعیت ہے اور دوسری اس فقہ کی استدلالی قوت ہے جس نے ہر دور میں لوگوں کو متأثر کیا ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے ۵-۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو اسلام آباد میں امام ابو حنیفہؒ کی حیات، فکر اور خدمات کے عنوان پر ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی۔ موجودہ کتاب اس کانفرنس میں پیش کیے جانے والے منتخب اردو مقالات کا مجموعہ ہے۔

اس میں نو مقالے شامل کیے گئے ہیں جو امام ابو حنیفہؒ کی شخصیت، ان کے دور اور حنفی مکتب فکر کی مختلف خصوصیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ مرتبین نے ان نو مقالہ جات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں حنفی اصول فقہ و حدیث سے متعلق موضوعات پر پیش کیے جانے والے مقالات شامل کیے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ امام ابو حنیفہ: عہد و شخصیت کے عنوان سے ہے جس میں دو مقالے درج کیے گئے ہیں اور تیسرا حصہ حنفی فقہ کی تدوین و اشاعت سے متعلق ہے جس میں تین مقالات درج کیے گئے ہیں۔ ہر مقالے کے آخر میں حوالہ جات و حواشی نقل کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی درج ہے۔

پہلا مقالہ "امام ابو حنیفہؒ کے فقہی اصول" کے عنوان سے مولانا گوہر رحمٰنؒ نے پیش کیا ہے۔[۹] محقق نے اس مقالے میں امام ابو حنیفہؒ کے کچھ اصول بیان کیے ہیں۔ آغاز میں امام ابو حنیفہؒ سے فقہ کی تعریف نقل کی ہے اور فقہ کی دیگر تعریفات سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ فقہ حنفی کے بنیادی مصادر کا تذکرہ کرتے ہوئے کتاب اللہ،

۹- محمد طاہر منصوری، عبد الحئی ابڑو (مرتبین) **امام ابو حنیفہؒ حیات و فکر اور خدمات** (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۲ء)، ۲۔

حدیث رسول اللہ ﷺ کا اجمالی تعارف کرایا ہے اور ابن امیر الحاج حنفی سے امام ابو حنیفہؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ خبر واحد کو قیاس پر مطلقاً ترجیح حاصل ہے، خواہ اس کا راوی فقیہ ہو یا غیر فقیہ۔[۱۰] اسی طرح سے اجماع، اقوالِ صحابہ اور قیاس و اجتہاد سے متعلق بھی امام صاحب کے نقطہ ہائے نظر کو بیان کیا ہے۔ مقالے کے آخر میں سوال اٹھایا ہے کہ کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟ اور پھر خود ہی مختلف آثار کا حوالہ دیتے ہوئے جواب دیا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہو۔ محقق نے مقالے کی تحریر میں بیانیہ طرز اسلوب اختیار کیا ہے اور بنیادی و ثانوی دونوں طرح کے مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

دوسرا مقالہ "امام ابو حنیفہؒ کے فقہی اصول و قواعد اور ان کی خصوصیات" کے عنوان سے محمد عبد القیوم ہزاروی نے پیش کیا ہے۔[۱۱] محقق کی رائے میں اجتہادی اصول جس قدر انسانی فطرت کے قریب ہوں گے اسی قدر مقاصدِ شریعت کے پاسدار اور انسان کے لیے آسانی و سعت کے حامل ہوں گے۔ حنفی فقہ ان خصوصیات کا آئنہ دار ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حنفی فقہ کی خصوصیات، مقاصد شرع کی پاس داری، جامعیت، فطرت کا لحاظ، عوام کے لیے آسانی اور وسعت، شخصی آزادی، ولایتِ نفس، تحفظ حقوق، ملکیت میں تصرف، حریت فکر، عرف و تعامل اور احترام انسانیت جیسے عناوین میں سمو کر حنفی فقہ کے نقطۂ نظر کو مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات کو دہرایا ہے کہ حنفی فقہ کی اس وسعت کے پیش نظر یہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے کہ قیامت تک پیش آنے والے مسائل کا حل حنفی فقہ میں موجود ہے۔[۱۲] محقق کا طرزِ تحقیق بیانیہ ہے اور بنیادی و ثانوی مصادر دونوں سے استفادہ کیا ہے۔

تیسرا مقالہ "امام ابو حنیفہؒ کے اصولِ اخذ و تحدیث" کے عنوان سے علی اصغر چشتی نے لکھا ہے،[۱۳] جس میں انھوں نے امام ابو حنیفہؒ کے استنباط سے پہلے روایات کے اخذ و قبول کے طرق اور اصول کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔[۱۴] اس سلسلے میں سند میں اتصال اور ارسال، ضبط راوی، سماع و قراءت، حدیث کی شہرت اور تواتر اور روایت باللفظ کے قبول یا رد کے حوالے سے امام ابو حنیفہؒ کے موقف کے ساتھ ساتھ دوسرے ائمہ، جن میں امام مالکؒ اور امام

۱۰- نفس مصدر، ۱۳۔

۱۱- نفس مصدر، ۲۹۔

۱۲- نفس مصدر، ۴۱۔

۱۳- نفس مصدر، ۴۵۔

۱۴- نفس مصدر، ۴۶۔

شافعیؒ شامل ہیں، کا نقطۂ نظر بیان کر کے جملہ ائمہ کی آرا کا تقابل بھی کیا ہے۔ مقالہ مختصر ہے، لیکن علمی و تحقیقی لحاظ سے مفید ہے۔ محقق نے بیانیہ اور تقابلی طرزِ تحقیق اختیار کیا ہے اور موضوع سے متعلق بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

چوتھا مقالہ "حنفی نظریۂ استحسان اور عصری مسائل" کے عنوان سے سعید الرحمٰن نے تحریر کیا ہے۔(۱۵) آغازِ مقالہ میں محقق نے تفصیل کے ساتھ حنفی نظریۂ استحسان، اس کی ماخذی و مصدری حیثیت کو بیان کیا ہے۔ عصری مسائل کے ضمن میں استحسان کے تحت بلڈ بینک کے قیام، جسمانی صحت کے لیے آپریشن، جسمانی عیب کے ازالے کے لیے عمل جراحی، غیر طبعی موت کے اسباب جاننے کے لیے پوسٹ مارٹم، اعضا کی پیوند کاری، جانوروں پر میڈیکل ریسرچ، عورت کی جان بچانے کے لیے اسقاطِ حمل، نرخ مقرر کرنا، اشیا کی اسمگلنگ کی ممانعت، اور خنزیر کے بالوں سے بوقت ضرورت سلائی کی اجازت پر بحث کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عصر حاضر میں اسلامی قانون سازی کے عمل میں استحسان کی اہمیت اور افادیت سے کسی صورت صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ محقق نے بیانیہ، تجزیاتی اور استدلالی طریقۂ تحقیق اختیار کیا ہے اور بنیادی و ثانوی دونوں طرح کے مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

پانچواں مقالہ "شعوبیت اور امام ابو حنیفہؒ" کے عنوان کے تحت محمد صدیق خان شبلی نے تحریر کیا ہے۔(۱۶) محقق نے بنو امیہ کے زمانے میں ابھرنے والی شعوبی تحریک پر قلم اٹھایا ہے اور اس پر اختصار سے روشنی ڈالی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی زندگی کا چوں کہ ایک طویل حصہ شعوبیت کے زمانے میں گزرا (جب کہ وہ خود عجمی تھے) لہٰذا اس تحریک کے امام صاحب پر ممکنہ یا مفروضہ اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی شعوبیت کے مفروضے کو دست یاب مصادر کی روشنی میں ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ مقالے میں بیانیہ اور تجزیاتی طریقۂ تحقیق اختیار کیا گیا ہے اور عربی، انگریزی دو زبانوں کے مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

چھٹا مقالہ "امام ابو حنیفہؒ پر اعتراضات اور ان کا جائزہ" کے عنوان سے از کیا ہاشمی نے تحریر کیا ہے۔(۱۷) اس میں انھوں نے مختلف افراد اور طبقوں کی طرف سے امام صاحب پر طعن و تنقید کے اسباب کو تاریخی تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے امام ابو حنیفہؒ پر نقد و جرح اور اس کے اہم ماخذ اور دفاع امام ابو حنیفہؒ اور اس کے اہم ماخذ اور ان پر نقد و نظر پر مفصّل گفت گو کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ امام صاحب ایک

۱۵۔ نفس مصدر، ۱۰۴۔

۱۶۔ نفس مصدر، ۱۱۱۔

۱۷۔ نفس مصدر، ۱۷۱۔

بالغ نظر فقیہ اور وسیع النظر عالم تھے۔ یہ تصور غلط ہے کہ وہ مغازی و سیر یا دیگر مروجہ علوم سے ناواقف تھے۔ محقق نے اس مقالے میں تاریخی اور تجزیاتی طریقۂ اسلوب اختیار کیا ہے اور بنیادی و ثانوی مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

ساتواں مقالہ ”آزادانہ قانون سازی کی اسلامی روایت اور امام ابو حنیفہؒ کا نمونۂ عمل“ کے عنوان سے محمد ہاشمی نے تحریر کیا ہے۔(۱۸) اس مقالے میں محقق نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا قانون سازی سرکاری سطح پر ہونی چاہیے؟ اس کا جواب تلاش کرنے کے لیے امام ابو حنیفہؒ اور اسلامی قانون سازی میں ان کے مؤقف اور نقطۂ نظر اور طریقے کو بیان کیا ہے کہ فقہ تقدیری کی تدوین کا خیال تو امام صاحب کو تھا، لیکن اس کے لیے انھوں نے جو طریقے اختیار کیے ان کے دو پہلو نمایاں ہیں: ایک تو غیر سرکاری یا آزادانہ قانون سازی اور دوسرے شورائی مذہب کی تدوین اور انھی طریقوں پر انھوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت بھی کی۔ آخر میں محقق لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون سازی کا کام اسی طریقے سے ہو گا جو امام ابو حنیفہؒ نے اختیار کیا اور اس کی تدوین جدید اور قاضیوں کی تربیت کے لیے تاریخ پھر کسی ابو حنیفہؒ کی منتظر ہے۔(۱۹) محقق نے تاریخی اور تجزیاتی طریقۂ تحقیق اختیار کیا ہے اور اپنی رائے کا برملا اظہار کیا ہے۔ تاریخی واقعات کے لیے بنیادی اور ثانوی دونوں طرح کے مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آٹھواں مقالہ ”برصغیر میں حنفی فقہ کا ارتقا“ کے عنوان سے محمد یوسف فاروقی نے لکھا ہے(۲۰) محقق نے اپنے اس مقالے میں برصغیر کے فقہا کی حنفی فقہ میں خدمات کا مختصر جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس خطۂ ارض کے فقہا اپنی دقت نظر، وسعت علم اور استدلال کی قوت میں بہت نمایاں رہے ہیں۔ اس مقالے میں فقہ کے چار علوم پر ہونے والے کام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن میں کتب فتاویٰ، اصول فقہ پر لکھی جانے والی کتب، احکام القرآن سے متعلق کتب اور فقہ کے موضوع پر عام کتب شامل ہیں۔

ان فقہا کی کاوشوں کا نتیجہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی علمی خدمت کی بدولت اس خطے میں فقہ حنفی کو اہل علم اور عوام الناس دونوں میں ایک جیسی مقبولیت حاصل رہی۔ محقق نے تاریخی طریقۂ تحقیق اختیار کیا ہے اور عربی و اردو دونوں زبانوں کے مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

۱۸- نفس مصدر، ۱۹۴۱۔

۱۹- نفس مصدر، ۱۹۵۔

۲۰- نفس مصدر، ۲۱۳۔

نواں مقالہ "امام ابو حنیفہؒ کی مجلس فقہ" کے عنوان سے افتخار الحسن میاں نے تحریر کیا ہے۔[۲۱] مقالے میں محقق نے امام ابو حنیفہؒ اور ان کی مجلس میں شامل ان کے شاگردوں امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری، امام زفر بن ہذیل بن قیس العنبری، امام محمد بن حسن شیبانی، اسد بن عمرو البجلی، داؤد بن نصیر الطائی الکوفی، قاسم بن معین بن عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن مسعود، یحیٰ بن زکریا بن ابی زائدہ، وکیع بن الجراح، معض بن غیاث بن خلق بن عمرو النخعی الکوفی، حبان بن علی الکوفی، مندل بن علی الکوفی، یحیی بن سعید القطان، عبد اللہ بن مبارک، یزید بن ہارون الوسطی، عبد الرزاق بن ھمام، الضحاک بن مخلد، حماد بن ابی حنیفہ، مسعر بن کرام، مکی بن ابراہیم البلخی، نوح بن ابی مریم، نوح بن دمراج الکوفی، ابو محمد النخعی، فضیل بن عیاض بن مسعود التمیمی، ابراہیم بن طہمان اور سعید بن اوس سمیت پچاس افراد کا اجمالاً تعارف کرایا ہے، جنھوں نے امام ابو حنیفہؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور فقہ حنفی کی تدوین، ترویج اور اشاعت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ محقق نے تاریخی طرزِ اسلوب اختیار کیا ہے اور بنیادی اور ثانوی دونوں مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

مرتبین کتب کی یہ کاوش اس لحاظ سے لائق تحسین ہے کہ زیر نظر کتاب میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ان مقالات کو جگہ دی جائے جن میں ابو حنیفہؒ کی حیات، فکر اور خدمات کا بہترین احاطہ کیا گیا ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کام یاب نظر آتے ہیں۔

امام محمد بن حسن الشیبانی اور ان کی فقہی خدمات

تالیف : ڈاکٹر محمد الدسوقی

مترجم : حافظ شبیر احمد جامعی اور ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

اشاعت : اول ۲۰۰۵ء،

صفحات : ٦٢٦

امت مسلمہ کی فقہی میراث نہ صرف مساوات، عدل و انصاف، دقیق قانونی نظریات اور انسانی مصلحتوں کا لحاظ رکھنے کی بنا پر نمایاں مقام رکھتی ہے، بلکہ علمی سرمایے کے لحاظ سے تاریخ انسانی میں منفرد شمار کی جاتی ہے۔ اس قانون سازی کی بنیاد چوں کہ قرآن و سنت پر قائم ہے، لہذا آرا اور نظریات میں اختلاف کے باوجود یہ علمی سرمایہ فقہا کی ایک کثیر تعداد کی محنتوں کا ثمر ہے جنھوں نے اس خدمت علم کے لیے بے مثال اخلاص کا مظاہرہ کیا

۲۱- نفس مصدر۔

ہے۔ ان فقہا میں امام محمد بن حسن بن مرقد الشیبانی (م۱۸۶ھ) ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے فقہ اسلامی کی تدوین کا کام جس انداز میں انجام دیا اس منہج واسلوب پر آپ سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا تھا۔

یہ منہج بالعموم مربوط اور منطقی تسلسل کے ساتھ واقعات فرض کرتے ہوئے مسائل کی تفصیلات و فروع بیان کرتے وقت عملی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہر مسئلے کے لیے شرعی حکم کے اثبات کے لیے اجتہاد کا رنگ لیے ہوتا ہے۔ آپ نے امام ابو حنیفہؒ (م۱۵۰ھ) کی فقہی روایت کو آگے بڑھایا۔ امام ابو حنیفہ کی فقہ و حدیث پر اپنی مرتبہ کوئی کتاب محفوظ نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کا تحریری کام محدود ہے۔ اس کے برعکس امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کی تالیفات فقہ و قانون کے سارے پہلوؤں کی جامع اور نہایت مفصل ہیں۔ امام محمد بن حسنؒ کو حنفی مکتبِ فکر اور اہل سنت کی فقہی روایت میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ اتنی علمی خدمات کے باوجود (مستقلاً) امام محمدؒ کی فکر و دانش کو موضوع بنا کر کم لکھا گیا۔

آپ کے شاگردوں نے آپ کی خدمات پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ برصغیر میں سب سے پہلے دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد نے اس جانب توجہ دی اور بعد میں لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ نے مولانا ابو الوفا افغانی کے زیرِ اہتمام امام شیبانی کی تالیفات شائع کیں۔[۲۲] شیخ محمد زاہد الکوثری نے **بلوغ الأماني في سيرة الإمام محمد بن حسن الشيباني** کے عنوان سے ایک مختصر رسالہ لکھا جس میں آپ کے حالاتِ زندگی کو مختصراً قلم بند کیا گیا۔[۲۳]

۱۰ مئی ۱۹۶۹ء کو امام مرحوم کا بارہ سو سالہ جشن جب ترکی میں منایا گیا تو اس موقع پر ان کی کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس ایک روزہ جشن میں صرف چار پانچ تقریریں ہوئیں۔ اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر محمد الدسوقی نے امام محمدؒ کی زندگی اور کارنامے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور **الإمام محمد بن الحسن الشيباني و أثره في الفقه الإسلامي** کے عنوان سے کتاب لکھی۔ بعد ازاں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے ڈاکٹر محمد الدسوقی کی کتاب کا ترجمہ پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی اور حافظ شبیر احمد جامعی نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ چھ سو چھبیس صفحات پر مشتمل ہے اور پہلی مرتبہ ۲۰۰۵ء میں شائع کیا گیا۔

۲۲۔ محمد الدسوقی، **امام محمد بن حسن شیبانی اور ان کی فقہی خدمات**، ترجمہ، حافظ شبیر احمد جامعی، یوسف فاروقی (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۵ء)، ۶۰۔

۲۳۔ نفس مصدر، ۱۸۔

ڈاکٹر محمد الدسوقی کا منہج / کتاب کا تعارف

ڈاکٹر محمد الدسوقی نے اپنی کتاب کا آغاز مختصر مقدمے سے کیا ہے۔ اس مقدمے میں انھوں نے ان اسباب کا مختصراً ذکر کیا ہے جن کی بنیاد پر انھوں نے یہ کتاب بعنوان **الإمام محمد بن الحسن الشيباني و أثره في الفقه الإسلامي** لکھنے کا آغاز کیا۔ اس میں انھوں نے امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کے علمی کارناموں اور ان کی اہمیت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مقدمے میں دسوقی نے نہ صرف اپنے علمی و تحقیقی مطالعے کے اسلوب کی وضاحت کی ہے بلکہ ان ماٰخذ و مصادر کا بھی ذکر کیا ہے جس پر دورانِ تحقیق میں انھوں نے اعتبار کیا اور رہ نمائی حاصل کی۔ دسوقی نے اس کتاب کو تمہید، پانچ ابواب، بارہ فصول اور خاتمے میں تقسیم کیا ہے۔ تمہید میں انھوں نے مختصراً عہدِ رسالت سے لے کر دوسری صدی ہجری کے نصف تک کی تاریخ کو بیان کیا ہے، جس میں انھوں نے کوفہ کی درس گاہ اور اس کے نام ور فقہا کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ تمہید کے بعد پہلا باب سیاسی، معاشرتی اور فکری حالات کے عنوان سے درج کیا ہے، جو تین فصول پر مشتمل ہے، جس میں انھوں نے امام محمدؒ کے دور کی سیاسی، معاشرتی اور فکری زندگی کو بیان کیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے فروعی مسائل کو نظر انداز کر کے صرف پیش آمدہ مسائل کو واضح کیا ہے۔ دوسرا باب امام محمدؒ کی حیات و خدمات کے عنوان سے ہے جو چار فصول پر مشتمل ہے پہلی فصل میں امام محمدؒ کی زندگی کے مختلف مراحل پر گفت گو کی گئی ہے۔ خصوصاً آپ کی تاریخ ولادت و وفات اور نسب کے حوالے سے تحقیق کی گئی ہے۔ دوسری فصل میں امام محمدؒ کے اپنے اساتذہ اور شاگردوں کے ساتھ تعلقات کو بیان کیا گیا ہے کہ آپ کس حد تک ان سے متاثر ہوئے اور کس حد تک ان کو متاثر کیا؟ تیسری فصل میں امام محمدؒ کی شخصیت کے اخلاقی پہلوؤں پر گفت گو کی گئی ہے۔ چوتھی فصل میں امام محمدؒ کے اُن آثار پر بحث کی گئی ہے جو ہم تک پہنچے ہیں یا نہیں پہنچ پائے۔ اس فصل میں دونوں طرح کے علمی آثار پر تحقیق کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جو متفق علیہ ہیں اور جن کے بارے میں اختلاف ہے۔ ساتھ ساتھ مستشرقین خصوصاً بروکلمان کی تردید بھی کی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ فقہ اسلامی کی تدوین کا اپنا اسلوب ہے اور جو بیرونی اسالیب کے اثرات سے محفوظ رہی ہے۔ تیسرا باب امام محمدؒ بحیثیت فقیہ و محدث کے عنوان سے درج ہے، جو تین فصول پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں امام محمدؒ کی کتب سے ماخوذ ان کے اصول اور ان کی فقہ کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ دوسری فصل میں حدیث اور رجالِ حدیث کے بارے میں امام محمدؒ کی معرفت پر گفت گو کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آپ اس حوالے سے اپنے ہم عصر ائمہ محدثین سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ اس ضمن میں نہ صرف بعض محدثین سے منقول ان آرا کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کو بنیاد بنا کر امام محمدؒ کو ضعف حدیث سے متہم کیا جاتا ہے، بلکہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ آرا صحیح دلائل پر مبنی نہیں ہیں۔ تیسری فصل

میں دسوقی نے دو چیزیں ثابت کی ہیں: پہلی یہ کہ امام محمدؒ مستقل مجتہد فقیہ تھے اور دوسری یہ کہ امام محمدؒ ایک کامل محدث تھے۔ چوتھا باب قانون اور شریعت کی روشنی میں قانون بین الممالک اور امام محمدؒ کا کارنامہ کے عنوان سے درج ہے۔ جس کو تین فصول میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں قانون وضعی میں قانون بین الممالک کی تاریخ اور عصر حاضر میں اس کے اصولوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دوسری فصل میں اسلام میں قانون بین الممالک کے اصولوں کو پیش کیا گیا ہے جو کہ امام محمدؒ نے اپنی کتابوں **السير الصغير** اور **السير الكبير** میں بیان کیے ہیں۔ تیسری فصل میں شریعت اور قانون وضعی کا موازنہ کرتے ہوئے قانون بین الممالک کے ماہرین کے درمیان امام محمدؒ کے مقام کو واضح کیا گیا ہے۔ پانچواں باب فقہ اسلامی میں امام محمدؒ کا کارنامہ کے عنوان سے درج ہے جس میں امام محمدؒ کے فقہ اسلامی کی تدوین پر اثرات اور ان کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا خاتمہ اہم نتائج بحث اور بعض تجاویز پر مشتمل ہے۔ [۲۴]

جن ماخذ و مصادر سے دسوقی نے اس کتاب کی تکمیل میں استفادہ کیا ہے ان کو چھے انواع میں تقسیم کیا گیا ہے:
اوّلاً: امام شیبانی کی اپنی تالیفات جن میں سے بعض تالیفات ہنوز قلمی نسخوں (مخطوطات) کی شکل میں ہیں، جیسے **الزيادات** اور **الأصل**۔ ثانیاً: امام محمدؒ کی کتب جو ثقہ راویوں کے ذریعے مروی ہیں، کی قدیم ترین شرح **المبسوط**، اسی طرح دیگر امہات الکتب جیسے امام شافعی کی **الأُم** اور امام کاسانی کی **البدائع و الصنائع في ترتيب الشرائع**۔ ثالثاً: مذہب حنفی کی کتب اصول اور دیگر معاون کتب جن میں محدثین نے اصول اور علومِ فقہ پر لکھا ہے۔ خاص طور پر شیخ علی الخفیف کی کتاب **أسباب اختلاف الفقهاء**، رابعاً: کتب تراجم، کتب طبقات، کتب تاریخ اور ان جیسی بعض ایسی کتب جو ابھی طبع نہیں ہوئیں۔ خامساً: دورِ حاضر میں قانون بین الممالک پر لکھی جانے والی کتب اور اسلامی قانون بین الممالک کے متعلق جدید کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ سادساً: متفرق تحقیقات جو شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک تحقیق مرحوم شیخ محمد فاضل بن عاشور کی کتب ظاہر الروایہ کے بارے میں ہے جو **مجلة مدينة الإسلام** (ترکی) Islam Medeneyeti میں شائع ہو چکی ہے۔ [۲۵]

الغرض امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کی زندگی اور ان کی فقہی خدمات کے موضوع پر یہ ایک بہترین تحریر ہے جس میں امام محمدؒ کی زندگی کے ہر پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ محقق نے امام محمدؒ کی تمام کتابوں ظاہر الروایۃ اور غیر ظاہر

۲۴۔ نفس مصدر، ۱۹-۲۱۔
۲۵۔ نفس مصدر، ۲۲۔

الروایۃ میں سے نہ صرف ہر ایک کو الگ الگ بیان کیا ہے، بلکہ ان کے مناہج، اسلوب اور وثاقت پر بھی سیر حاصل (علمی و تحقیقی) بحث کی ہے۔ کتاب کا اسلوب علمی اور محققانہ ہے۔ جہاں پر بھی کوئی رائے دی گئی ہے دلیل کی بنیاد پر دی گئی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں محقق نے بیانیہ طرزِ تحقیق اختیار کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تجزیاتی طریقۂ تحقیق بھی اپنایا ہے۔ بعض مقامات پر واقعات بیان کر کے ان کے بارے میں مختلف آرا نقل کرتے ہیں اور پھر دلائل کی بنیاد پر یا تو ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دیتے ہیں یا پھر اپنا موقف پیش کرتے ہیں۔

امام محمدؒ کی پیدائش کے بارے میں راجح رائے

امام محمد بن حسنؒ کی پیدائش سے متعلق بعض مؤرخین کے اقوال نقل کرتے ہیں کہ کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ امام محمدؒ کی ولادت ۱۳۱ھ میں ہوئی۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ کی ولادت ۱۳۳ھ میں ہوئی اور بعض کا خیال ہے کہ ۱۳۵ھ میں ہوئی۔ دسوقی محدثین کی وضاحت کے مطابق اس قول کو، کہ آپ ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے، غلط قرار دیتے ہیں اور دلیل کے طور پر امام محمدؒ کا اپنا قول پیش کرتے ہیں کہ میرے والد جب مجھے امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں لے گئے، اس وقت میری عمر چودہ برس تھی۔ نیز فرمایا کہ امام ابو حنیفہؒ نے مجھے ان دنوں داغِ مفارقت دیا، جب میری عمر سترہ برس تھی۔ اس کی تائید شیرازی کی **طبقات الفقہاء** سے لیتے ہیں کہ امام محمدؒ کئی سال تک امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں شریک رہے۔ اس کے بعد امام ابو یوسفؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی پھر مرحوم شیخ زاہد الکوثری کی تحقیق نقل کرتے ہیں کہ ان کے مطابق امام محمدؒ کا سنِ ولادت ۱۳۲ھ ہے۔ اور قدیم مؤرخین کا اسی پر اتفاق ہے۔ آخر میں اپنی رائے دیتے ہیں کہ شاید درست یہی ہے کہ امام محمدؒ ۱۳۱ھ کے اواخر یا ۱۳۲ھ کے اوائل میں پیدا ہوئے۔[۲۶]

بعض مقامات پر واقعات کو تاریخی اعتبار سے جانچ پڑتال کرتے ہیں اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر محقق کی رائے میں امام اوزاعی نے کتاب **السير الكبير** نہیں دیکھی تھی، کیوں کہ امام محمدؒ نے یہ کتاب امام اوزاعی کی وفات کے تقریباً بیس سال بعد تصنیف کی تھی۔ اس بنیاد پر مقدمہ **شرح السرخسي** میں **السير الكبير** کے سبب تالیف کے متعلق جو کچھ مذکور ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔[۲۷]

۲۶۔ نفس مصدر، ۹۵-۹۶۔

۲۷۔ نفس مصدر، ۲۰۰-۲۰۴۔

اکثر مقامات پر محقق کا موقف مروّجہ آرا سے ہٹ کر ہے۔ مثال کے طور پر ایک طویل بحث کے بعد محقق کی رائے میں امام محمدؒ مجتہد مطلق ہیں۔ آپ نے اپنے اجتہاد، اثر اور رائے کو یک جا کر دیا ہے۔ اثر اور رائے میں تعارض کی صورت میں آپ رائے کو اثر (حدیث ، قول صحابی) پر مقدم نہیں رکھتے اور آپ نے شیخین (امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ) کے مقابلے میں ظاہری مفہوم کو کثرت سے لیا ہے۔ امام محمدؒ کے فقہی اصول بحیثیت مجموعی عام فقہا کے اصولوں کے ساتھ متفق ہیں، البتہ بعض فقہا کے اصولوں سے جزوی مسائل میں مختلف ہیں۔ لیکن ان کا دارو مدار بھی انھیں اصولوں پر ہے۔ محقق کے نزدیک حنفی مذہب محض امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ فقہا کی ایک جماعت کی فقہ کا نام ہے جو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی عراق میں تشریف آوری سے لے کر امام محمدؒ کے زمانے تک جماعت در جماعت علمی میراث کے طور پر منتقل ہوتی آئی ہے۔ [۲۸]

اسی طرح عباسی دور کے حوالے سے محقق ایک طویل بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عباسی خلافت کے ابتدائی حصے میں فقہی سرگرمیوں کے عروج کا سبب یہ نہیں تھا کہ حکام نے فقہا کو قدر و منزلت دی اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ محقق کے نزدیک تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بعض عباسی خلفا نے امت کے امور میں دل چسپی لی، دینِ حنیف کے احکام کی پیروی کی اور بعض فقہا سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے ایسی کتابیں تیار کریں کہ جو احکام کی تنفیذ میں ان کے لیے معاون ہوں، لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ فقہ کی ترقی اور علم اور اہل علم کی تکریم کا احسان اور سہرا دولتِ عباسیہ کے سر ہے۔ یقیناً یہ موضوع تحقیق طلب ہے، اس لیے کہ عباسی خلفا نے بہ ہر حال اپنے دور میں فقہا کی حوصلہ افزائی کی اور اسی بنیاد پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں فقہ نے باقی ادوار کی نسبت سب سے زیادہ ترقی کی۔ [۲۹]

محقق کی تحقیق کے مطابق امام محمدؒ ایک محدث تھے جو مرتبے و مقام کے لحاظ سے اپنے معاصر محدثین سے کسی طرح کم نہ تھے۔ آپ کی **کتاب الآثار** دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث کے منہج سے مطابقت کی بنا پر اس صدی کی کتب حدیث میں شمار ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ بات، (جس پر مؤرخین کا اتفاق ہے)، درست نہیں ہے کہ دوسری صدی ہجری میں مدوّن ہونے والی کتب حدیث میں سے سوائے امام محمدؒ کی روایت کردہ **الموطأ** کے کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی، کیوں کہ امام محمدؒ کی **کتاب الآثار** اپنے منہج تدوین اور اپنی صحت کے لحاظ سے **موطأ الإمام**

۲۸- نفس مصدر، ۴۹۶۔

۲۹- نفس مصدر، ۷۳۔

مالک سے مختلف نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ امام محمدؒ نے **کتاب الآثار** لکھی، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ امام محمدؒ محدث تھے، شاید مبالغہ آرائی ہے، کیوں کہ ایک طرف تو اس بات کو نہ صرف تسلیم کیا جارہا ہے، بلکہ زور دیا جا رہا ہے کہ فقہ حنفی کی جامع تدوین کا سہرا امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کے سر ہے اور دوسری طرف ساتھ ہی ساتھ انھیں مستقل محدث بھی قرار دیا جارہا ہے۔ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہے کہ انھوں نے حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی اور حدیث و رجال حدیث کی معرفت رکھتے تھے، لیکن آپ ایک مستقل محدث تھے۔ یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔(۳۰)

محقق کے نزدیک یہ درست نہیں ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے امام محمدؒ کے خلاف سازش کی تھی، تاکہ ہارون الرشید کے دربار میں آپ ان کے مد مقابل نہ بن جائیں۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ امام شافعیؒ نے ہارون الرشید کی مجلس میں امام محمد کو لاجواب کر دیا تھا یا یہ روایت کہ امام محمدؒ نے ہارون الرشید کے پاس امام شافعیؒ کی چغلی کی تھی۔ اس طرح کے اختلافات کی روایات کے حوالے سے محقق خطیب بغدادی کا حوالہ دیتے ہیں اور پھر ان کی رائے کی تردید کرتے ہیں۔ محقق کے نزدیک امام محمدؒ اپنے شیخ امام ابو یوسفؒ کی زندگی ہی میں اہلِ بغداد کے اہل رائے کا مرجع بن گئے تھے۔(۳۱)

محقق نے بعض مقامات پر تقابلی طرزِ استدلال اختیار کیا ہے۔ خصوصاً قانون بین الممالک کے موضوع کی بابت یہ اسلوب بڑا واضح ہے۔ محقق کے نزدیک اسلام نے تقریباً چودہ سو سال پہلے بین المماک تعلقات کے اصول مقرر کر لیے تھے جو کہ انسانی مساوات پر مبنی ہیں، کیوں کہ تمام انسان ایک ہی امت ہیں۔ تقویٰ اور عملِ صالح کے سوا ان کے درمیان فضیلت و برتری کا اور کوئی معیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امن و سلامتی انسانوں کے درمیان تمام تعلقات کی بنیاد ہے۔ جب کہ وضعی قانون بین الممالک کا ارتقا وقت کے ساتھ ساتھ بین الممالک حالات اور فکرِ انسانی کے ارتقا کے مطابق ہوا، لیکن قانون بین الممالک گروہی اور نسلی امتیازات سے محفوظ نہ رہ سکا، حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ کے زمانے میں بھی صورتِ حال ایسی ہی نظر آتی ہے۔ قابل ترجیح بات یہی ہے کہ کتاب **اختلاف أبي حنيفة و ابن أبي ليلى** کو امام ابو یوسف کے بجائے امام محمدؒ کی طرف منسوب کیا جائے۔

۳۰۔ نفس مصدر، ۳۷۱۔

۳۱۔ نفس مصدر، ۳۹۷۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما

مرتب : محمد خالد مسعود

مطبع : ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

اشاعت اول : ۲۰۰۸ء

صفحات : ۴۶۵

برصغیر کی فکری، علمی، ثقافتی اور ملی تاریخ میں اٹھارویں صدی عیسوی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور میں ایک طرف نہ صرف سیاسی طور پر مسلمان روبہ زوال تھے، بلکہ علمی، فکری اور ثقافتی طور پر بھی تنزل کی طرف گامزن تھے۔ مسلم سماج شکست وریخت سے دوچار تھا اور اس کی بڑی وجہ ہندو تہذیب اور فلسفے کے وہ اثرات تھے جن کو مسلم معاشرے نے قبول کیا تھا۔ مختلف النوع رسوم ورواج اور بدعات جو اسلامی شریعت کے مقاصد اور اسلامی اقدار سے متصادم تھے، کا دور دورہ تھا۔ دوسری طرف مسلمان اہل علم و قلم جدید علوم و نظریات اور جدید فکر کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان سے کوسوں دور تھے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر اس دور کے اہل علم و دانش نے اندھی تقلید اسلامی اقدار و مقاصد سے روگردانی اور فکری جمود کے خلاف آواز بلند کی جس کے اثرات انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی دکھائی دیتے ہیں، جب احیاے دین اور استعماری قوتوں سے آزادی کے حصول جیسی تحریکوں کا ظہور ہوا۔

مسلمانوں کی علمی، فکری، سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں اس دور کی اہمیت کے سبب ادارہ تحقیقات اسلامی نے **اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کا جائزہ** کے عنوان پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا۔[۳۲] کتاب کے حرف اوّل میں جناب ظفر اسحاق انصاری نے ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی ان کاوشوں کو سراہا ہے جو انھوں نے مذاکرے کے انعقاد اور اس کے بعد مقالات کی ترتیب کے سلسلے میں کیں۔[۳۳]

اس کے بعد انھوں نے ادارہ تحقیقات اسلامی کے ادارتی شعبے کے سابق سربراہ جناب ڈاکٹر سفیر اختر اور اس وقت کے موجودہ سربراہ جناب سید افضل اقبال کا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔ عرضِ مرتب میں ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے کئی لحاظ سے اس مذاکرے کی انفرادیت کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر ماہ اس مذاکرے کی نشست کا اہتمام ہوتا

۳۲۔ محمد خالد مسعود، (مرتب) **اٹھارویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما** (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۸ء)، ٦۔

۳۳۔ نفس مصدر، ۷۔

تھا، دوسرا یہ کہ مقالہ نگار مذاکرے میں شرکت سے پہلے مقالہ بھجواتے تھے اور تیسرے یہ کہ مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اہل قلم نے اس میں شرکت کی جن میں تاریخ کے ماہرین، شاعر و ادیب، علوم اسلامی کے متخصِّصین، مختلف زبانوں کے ماہرین اور علم لغت و اصطلاحات کے اساتذہ شامل ہیں۔[۳۴] زیادہ تر شخصیات کا تعلق دہلی سے ہے، تاہم دیگر علاقوں کی علمی شخصیات کی نمائندگی بھی کسی حد تک نظر آتی ہے۔[۳۵]

مرتب نے ان اہم سوالات یا بنیادی نکات کا ذکر کیا ہے جو دورانِ مذاکرہ میں بحث و نظر کا موضوع رہے۔ ان میں پہلا سوال اٹھارویں صدی میں انحطاط کی نوعیت، دوسرا سوال ریاست و معاشرت اور تیسرا سوال ہند و اور مسلم تعلق کے حوالے سے تھا، جن کے جواب میں اہل علم و دانش کے مختلف رجحان سامنے آئے۔[۳۶]

کتاب میں اٹھارویں صدی کے دس بڑے مشاہیر کے افکار و خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، خواجہ میر درد، مرزا عبد القادر بیدل، شاہ عبد الطیف بھٹائی، مرزا مظہر جان جاناں، سید غلام علی آزاد بلگرامی، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی اور مرزا ابو طالب شامل ہیں۔ کتاب میں مقالات کی ترتیب شخصیات کے سنین وفات کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ ہر مقالے کے آخر میں حواشی اور حوالے دیے گئے ہیں، کتاب کا عنوان نسخ میں دیا گیا ہے تا کہ باقی تمام مندرجات سے ممتاز ہو۔ کتاب کے آخر میں رجال اور اسماے کتب و جرائد کا اشاریہ بھی درج کیا گیا ہے۔[۳۷]

مقالات سے پہلے مرتب نے بہتر صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں اٹھارویں صدی میں اسلامی تہذیب کے خدوخال، عالم اسلام کی تینوں بڑی سلطنتیں، عثمانیہ (دنیاے عرب اور یورپ)، صفویہ (ایران) اور مغلیہ (برصغیر پاک و ہند) کی زوال پذیری اور یورپ کی علمی، فکری اور سیاسی تحریکوں کے ان پر اثرات، سلطنت مغلیہ کا طرزِ سیاست و حکومت، برصغیر پاک و ہند کی معیشت، معاشرت، اس دور کی علمی درس گاہوں، فکری و تحقیقی سرگرمیوں، ادب، فنون لطیفہ، فن مصوری و نقاشی، اور فنِ تعمیر کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ برصغیر میں اٹھارویں صدی یورپ کی طرح روشن خیالی کی صدی تھی،[۳۸] لیکن

۳۴۔ نفس مصدر، ۱۰۔

۳۵۔ نفس مصدر، ۹۔

۳۶۔ نفس مصدر، ۱۲۔

۳۷۔ نفس مصدر، ۱۸۔

۳۸۔ نفسِ مصدر، محقق نے ڈاکٹر عبد الغنی کی تصنیف **فیض بیدل** کے علاوہ مرزا بیدل کی دیگر تصنیفات اور شعرا کے تذکروں میں درج معلومات کے ذریعے حالات وواقعات کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ ۸۵۔

اٹھارویں صدی میں برصغیر کی اسلامی فکر نے تطبیق، تحقیق اور تنقید کی روایت کی جو طرح ڈالی تھی، انیسویں صدی میں وہ تسلسل ٹوٹ گیا اور نئی ترجیحات نے جنم لیا۔ مرتب نے اس مقدمے میں جہاں تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے، وہاں جابجا اپنے نقطۂ نظر کا بھی بر ملا اظہار کیا ہے۔ مقدمے کی تحقیق میں قدیم و جدید اردو اور انگریزی کے مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا مقالہ فارسی کے عظیم شاعر مرزا عبد القادر بیدل (۱۶۴۴۔ ۱۷۲۰ء) کے بارے میں ہے جسے ڈاکٹر رحیم بخش شاہین مرحوم نے تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ چھیالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مقالے کے آغاز ہی میں مقالہ نگار نے ان مآخذ کا ذکر کر دیا ہے جہاں سے انھوں نے مرزا صاحب کے حالات و واقعات نقل کیے ہیں۔[۳۹] مقالہ نگار نے مقالے میں مرزا بیدل کے حالاتِ زندگی اور بحیثیت شاعر ان کی مقبولیت کا تذکرہ کیا ہے۔[۴۰] ان کے اشعار کی تعداد تقریباً ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان کے آثار نظم میں **دیوان بیدل**، **مثنوی محیطِ اعظم**، **مثنوی طلسم حیرت**، **مثنوی طور معرفت یا گلگشت حقیقت**، **مثنوی عرفان**، **تنبیہ المہوسین**، اور آثار نثر میں **چہار عنصر**، **رقعات**، **نکات**، **تالیف الاحکام** اور **متفرقات** شامل ہیں۔[۴۱]

مرزا صاحب فطری شاعر تھے۔ وہ شاعری کی معنی آفرینی سمجھتے تھے لیکن ان کی معنی آفرینی محض خیال پرستی نہیں تھی، بلکہ اس کے پیچھے ان کا گہرا مطالعہ مشاہدۂ فطرت اور غور و فکر ہے۔[۴۲] آپ اندھی تقلید سے محترز رہے۔ محقق کی تحقیق کے مطابق مرزا بیدل مجاذیب کے کشف و کرامات کے معتقد تھے، لیکن مجموعی طور پر وہ رسمی تصوف کے خلاف عمل پیرا رہے۔[۴۳] بیدل کا شمار ان مفکرین میں ہوتا ہے جن کے غور و فکر کا مرکز ایک بہترین انسان کی تلاش ہے۔[۴۴] بیدل اپنے زمانے کے علمی ذوق اور معیار سے مطمئن نہ تھے، ان کے نزدیک مسلم سماج ابتری کا شکار ہو رہا تھا اور مسلم تہذیب ایجاد کی صلاحیت سے محروم ہو رہی تھی۔ لہٰذا اسی خطرے کے پیشِ نظر انھوں نے علم و تحقیق اور تقلید کے سلسلے میں بہت کثرت سے لکھا ہے۔[۴۵] مقالہ میں بیدل کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں

۳۹۔ نفس مصدر، ۹۰۔

۴۰۔ مقالہ نگار نے ان کا اجمالی تعارف درج کیا ہے۔ ۹۶-۹۹۔

۴۱۔ خالد مسعود، مصدر سابق، ۱۰۴۔

۴۲۔ نفس مصدر، ۱۱۰۔

۴۳۔ نفس مصدر، ۱۱۹۔

۴۴۔ فاطمی صاحب نے یہ مقالہ انگریزی زبان میں تحریر کیا تھا جس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

۴۵۔ خالد مسعود، مصدر سابق، ۱۳۱۔

کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر مقالے کا منہج بیانیہ ہے۔ محقق نے جابجا بیدل کے اشعار نقل کیے ہیں تا کہ ان کی بات کو بہتر انداز میں قاری تک پہنچایا جا سکے۔

دوسرا مقالہ شاہ عبد الطیف بھٹائی (۱۶۸۹-۱۷۵۲ء) کے عنوان سے سید قدرت اللہ فاطمی نے تحریر کیا ہے۔(۴۶) یہ مقالہ انیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مقالے میں محقق نے پہلے شاہ عبد الطیف کے دور میں شرفا کے عوام کے ساتھ استحصالی رویے اور پھر اس کے ردِ عمل میں شاہ عبد الطیف بھٹائی کی شاعری اور افکار کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا شاہ عبد اللطیف کانٹ اور ہیگل کی طرح اپنی دنیا میں رہتے تھے؟ محقق اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ شاہ پیہم حرکت میں رہتے تھے۔(۴۷) ان کے اشعار پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ اس وقت کے جغرافیے پر عبور رکھتے تھے اور دنیا کے حالات سے واقف تھے۔(۴۸) انھوں نے اپنے افکار میں اپنے عہد کے سیاسی حالات کو ہر گز درخور اعتنا نہیں سمجھا، اور اہم اقتصادی واقعات پر انھوں نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ جن مصادر سے محقق نے استفادہ کیا ہے وہ قابلِ اعتبار گردانے جاتے ہیں۔(۴۹)

تیسرا مقالہ ”مرزا مظہر جان جاناں (۱۶۹۹-۱۷۸۰ء)“ کے عنوان سے محمد صدیق خان شبلی نے تحریر کیا ہے، جو کہ اڑتیس صفحات پر مشتمل ہے۔(۵۰) بنیادی طور پر مقالے میں مرزا مظہر جان جاناں کے حالاتِ زندگی ان کی علمی و فکری زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر گفت گو کی گئی ہے۔ ان کی شخصیت کتنی محترم تھی اس کے اظہار کے لیے محقق نے ان کے ہم عصر مفکرین کی آرا بھی نقل کی ہیں۔(۵۱) مرزا صاحب خالص نقشبندی تھے اور اس مذہب پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ انھوں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور تمام عمر شریعت اور سنت نبوی کی اتباع میں گزاری۔(۵۲) آپ نے اپنے مریدوں کو ہمیشہ اتباعِ شریعت کی تعلیم دی۔(۵۳) سماع کے بارے میں آپ کا

۴۶- نفس مصدر، ۱۳۲۔
۴۷- نفس مصدر، ۱۳۳۔
۴۸- نفس مصدر، ۱۴۴۔
۴۹- نفس مصدر، ۱۴۹۔
۵۰- نفس مصدر، ۱۵۵۔
۵۱- نفس مصدر، ۱۵۸۔
۵۲- نفس مصدر، ۱۵۹۔
۵۳- نفس مصدر، ۱۶۱۔

نقطۂ نظر نقشبندی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔[۵۴] مرزا صاحب کی رائے کے مطابق ممالک ہند میں بھی انبیا اور رسل آئے لیکن قرآن ان کے بارے میں خاموش ہے۔[۵۵] مرزا صاحب کے نزدیک ہندوؤں کا سجدہ، سجدۂ تحیت ہے نہ کہ سجدۂ عبودیت۔[۵۶] مرزا صاحب کے عہد میں برصغیر میں مسلم حکومت تیزی سے روبہ زوال تھی اس دور میں خانقاہ مظہریہ نے لوگوں کی باطنی تربیت کرنے کا بیڑا اٹھایا اور یہ فریضہ بہ طریق احسن پورا کیا۔ محقق نے انگریزی اور اردو زبان کے بنیادی اور ثانوی دونوں طرح کے مصادر سے استفادہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر مقالے کا منہج سوانحی اور تاریخی ہے۔

چوتھا مقالہ "شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۲۔ ۱۷۶۲ء)" کے عنوان سے ایم۔ ایس۔ ناز کا تحریر کردہ ہے، جو چونتیس صفحات پر مشتمل ہے۔[۵۷] مقالہ نگار نے شاہ ولی اللہؒ کی ابتدائی زندگی، علمی نشوونما، تحصیل علم کے لیے بین الاقوامی اسفار، ان کی تصانیف، اس دور کے سیاسی و اقتصادی حالات اور آپ کی فکر کا اجمالاً تذکرہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے عہد میں مسلمانوں کے سیاسی و معاشی زوال کے باوجود، اسلامی فکر اور تہذیب کو زوال کا شکار نہ ہونے دیا اور فکری جمود اور اندھی تقلید کے خلاف قلم اٹھایا اور اعتدال بین التقلید و الاجتہاد کی راہ اختیار کرنے پر زور دیا۔[۵۸] فکر ولی اللہی کی امتیازی خصوصیت بیان کرتے ہوئے مقالہ نگار رقم طراز ہے کہ ان کے تمام افکار و نظریات کی روح عدل عمرانی کا تصور ہے اور آپ کی علمی اور عملی زندگی کا حاصل آپ کا پیغام اصلاح و تجدید ہے۔[۵۹] مجموعی طور پر مقالے کا منہج بیانیہ ہے۔ محقق نے بنیادی ماخذ و مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

پانچواں مقالہ "سید غلام علی آزاد بلگرامی (۱۷۰۴-۱۷۸۶ء)" کے عنوان سے محمد اسحاق قریشی نے تحریر کیا ہے جو چھیالیس صفحات پر مشتمل ہے۔[۶۰] آپ اپنے دور کے ایک عظیم شاعر تھے اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ آپ کی زندگی کا نمایاں عنصر تھا۔[۶۱] محقق نے اپنے مقالے میں سید صاحب کی ابتدائی زندگی، علمی نشوونما، عربی

۵۴۔ نفس مصدر، ۱۶۲۔
۵۵۔ نفس مصدر۔
۵۶۔ نفس مصدر۔
۵۷۔ نفس مصدر، ۱۷۱۔
۵۸۔ نفس مصدر، ۱۹۶۔
۵۹۔ نفس مصدر، ۱۹۸۔
۶۰۔ نفس مصدر، ۲۰۵۔
۶۱۔ نفس مصدر، ۲۰۷۔

تصانیف، فارسی تصانیف، ان کے سیرت و کردار اور ان کی شاعری کے موضوعات کا ذکر کیا ہے۔ سید آزاد کی شاعری میں مدح شمائل سیرت، قصائص ذات و نبی کریم ﷺ اور ان کے امتیازات کو خاص مقام حاصل ہے۔ آپ کا انداز موضوعی ہے۔ اس لیے انھوں نے سیرت طیبہ کے ان شمائل کا انتخاب کیا ہے جن کے حصول فیض کے وہ خود متمنی تھے، مثلاً خلق عظیم اور کرم بے عدیل، رحمت بے مثیل۔ سید آزاد کے دور کے معاشرتی حالات اگر پیشِ نظر رہیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس سماج کا ہر فرد ان شمائل کا طلب گار نظر آتا ہے۔[۶۲] مقالہ نگار نے بیانیہ منہج تحقیق کے ساتھ ساتھ تجزیاتی اسلوب بھی اختیار کیا ہے۔ بنیادی اور ثانوی دونوں طرح کے مآخذ و مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

چھٹا مقالہ ”قاضی محمد اعلیٰ تھانوی (۱۷۰۸-۱۷۷۷ء)“ کے عنوان سے عطش درانی نے تحریر کیا ہے، جو چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔[۶۳] علامہ تھانوی کا شمار ان عظیم شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اسلامی اصطلاحات نگاری میں اپنی قاموسی لغت ”**کشاف اصطلاحات الفنون** تکمیل (۱۷۴۵ء) سے اسلامی دنیا کی علمی خدمت کی۔ اسی وجہ سے محقق نے آپ کو ”اصطلاح نگار“ قرار دیا ہے، نہ کہ اصطلاح ساز یا نعت نگار۔[۶۴] محقق نے اپنے مقالے میں آپ کا مختصر تعارف کرایا ہے اور آپ کے علمی کارناموں پر گفت گو کی ہے۔ جن کو سپر نگر جیسے مستشرق نے ترتیب و تدوین کے بعد شائع کرایا ہے۔ آپ کی اس تصنیف کے علاوہ ایک دوسری تصنیف **أحکام الأراضي** کا ذکر بھی اجمالاً کیا ہے۔ محقق کی طرف سے اس ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ آپ کے احوال و آثار کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تا کہ علمی دنیا آپ کے نہ صرف علمی کارناموں سے واقف ہو سکے بلکہ نعت، زبان اور اصطلاحات کے حوالے سے مزید مفید کام ہو سکیں۔ مقالے کا منہج بیانیہ ہے اور محقق نے حواشی اور حوالہ جات بڑی دقت کے ساتھ درج کیے ہیں۔

ساتواں مقالہ ”خواجہ میر درد دہلوی (۱۷۲۱-۱۷۸۵ء)“ کے عنوان سے محمد صدیق شبلی نے تحریر کیا ہے، جو چھبیس صفحات پر مشتمل ہے۔[۶۵] خواجہ میر درد اپنے عہد کے عظیم صوفی مفکر تھے جنھوں نے حضرت مجدد

۶۲- نفس مصدر، ۲۲۱۔

۶۳- نفس مصدر، ۲۵۰۔

۶۴- نفس مصدر۔

۶۵- نفس مصدر، ۲۷۵۔

الف ثانی کے بعد ایک مکمل نظام تصوف پیش کیا اور اپنے زمانے میں زوال پذیر تصوف کی اصلاح کی۔[۶۶] محقق نے اپنے مقالے میں خواجہ میر درد کے حالاتِ زندگی کا اجمالاً ذکر کیا ہے، لیکن آپ کی تصانیف اور تصوف کے حوالے سے آپ کے صوفیانہ افکار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ منہج تحقیق سوانحی ہے۔ انگریزی اور اردو دونوں طرح کے مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آٹھواں مقالہ "قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۷۳۰-۱۸۱۰ء)" کے عنوان سے محمد طفیل ہاشمی کی تحریر ہے، جو بائیس صفحات پر مشتمل ہے۔[۶۷] قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنے دور کی عظیم شخصیت گزرے ہیں جن کا خصوصی میدان فقہ و قضا تھا۔ آپ چالیس سال سے زائد منصب قضا پر فائز رہے اور اسی وجہ سے اپنی تفسیر میں عدالتی معاملات کے بارے میں اپنے زمانے کے حالات و واقعات اور اپنے تجربات کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہا کے اقوال کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔[۶۸] محقق نے قاضی صاحب کے حالاتِ زندگی کا مختصر تعارف کرانے کے بعد ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں اور نظریات کو بیان کیا ہے۔ آپ کے رسالے **حقیقتِ اسلام** پر علمی و تحقیقی تبصرہ بھی کیا ہے اور آپ کی بصیرت کا اعتراف کیا ہے۔ منہج تحقیق بیانیہ اور تجزیاتی ہے اور بنیادی مآخذ و مصادر سے استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نواں مقالہ "شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۷۴۶-۱۸۲۴ء)" کے عنوان سے محمد خالد مسعود نے تحریر کیا ہے، جو چونتیس صفحات پر مشتمل ہے۔[۶۹] محقق نے شاہ صاحب کے حالات زندگی کا اجمالاً تذکرہ کرنے کے بعد ان کے عہد، اس عہد میں مذہب اور معاشرت کی صورت حال، تصوف کے اثرات، شیعیت، ریاست کے ٹکراؤ اور شاہ صاحب کے کردار پر سیر حاصل بحث کی ہے اور آپ کے فتاوی کا بھی ذکر کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاہ صاحب نے مذہبی معاشرت کو ریاست اور حکومت کی احتیاج سے آزاد رہ کر دینی اقدار کی حفاظت کی جو فکر دی تھی وہ بیسوی صدی کی ریاست پسند سیاسی اسلامی فکر کی تاریخی تعبیر میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔[۷۰] محقق نے بیانیہ اور تجزیاتی طریقہ اختیار کیا ہے اور انگریزی اور عربی کے مصادر و مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

۶۶- نفس مصدر، ۲۹۸۔
۶۷- نفس مصدر، ۳۰۱۔
۶۸- نفس مصدر، ۳۰۵-۳۰۶۔
۶۹- نفس مصدر، ۳۲۳۔
۷۰- نفس مصدر، ۳۵۱۔

دسواں مقالہ "شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۷۵۰-۱۸۱۸ء)" کے عنوان سے سید از کیا ہاشمی نے تحریر کیا ہے، جو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔[۷۱] شاہ ولی اللہؒ کی فکر کی تشریح و تعبیر میں آپ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلوی کا مقام سب سے نمایاں ہے۔[۷۲] آپ علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ ریاضی، منطق، فلسفہ اور عقلیات میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ محقق نے آپ کے حالاتِ زندگی، علمی سرگرمیوں، تصانیف، آپ کے ترجمہ و تفسیر قرآن مجید، آپ کے افکار و نظریات اور آپ کی علمی تحریک کا تذکرہ کیا ہے۔ مقالے کا منہج بیانیہ اور تجزیاتی ہے۔ محقق نے عربی اور اردو کے بنیادی و ثانوی مآخذ و مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی یہ کاوش لائق تحسین ہے کہ انھوں نے برصغیر میں اٹھارویں صدی کی ان نمایاں شخصیات کے بارے میں اس قدر علمی و تحقیقی مقالات درج کیے ہیں جن پر فکر و تدبر کے بعد عصر حاضر میں اس خطے کے مسلمان رہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی حیات و افکار کے چند پہلو

ترتیب و تدوین : سفیر اختر

طبع اوّل : ۲۰۰۳ء

طبع دوم : ۲۰۱۵ء

بیسویں صدی کی اسلامی فکر و دانش میں علامہ محمد اقبال، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا الیاس اور مولانا محمد زکریا جیسے اہلِ نظر اور اصحابِ دعوت کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے احیاے اسلام کے معماروں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ آپ نام ور عالم دین، دانش ور، مصنف، منفرد مؤرخ و سیرت نگار، ایک صاحب طرز ادیب اور ایک سحر انگیز خطیب تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ ایک داعی، مصلح، مبلغ اور مربی بھی تھے۔ ان تمام اوصاف کے اجتماع نے آپ کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو جب مولانا مرحوم کی رحلت ہوئی تو اس کے فوراً بعد ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے ان کی یاد میں ایک روزہ سیمینار کا اہتمام کیا۔ (۲۱ فروری ۲۰۰۰ء)۔ جس کی اردو اور عربی کی الگ الگ نشستوں

۷۱- نفس مصدر، ۳۵۵۔

۷۲- نفس مصدر۔

میں اہل علم نے مرحوم کی زندگی کی مختلف جہتوں اور ان کے افکار و نظریات کے جملہ پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے اختتام پر اس بات کا اظہار کیا گیا کہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالہ جات شائع کیے جائیں گے۔[۷۳] لیکن ان مقالات کی ترتیب و تدوین میں بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے تاخیر ہوئی اور بعض حضرات نے اپنے مقالات مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرا دیے، لہٰذا زیر نظر مجموعۂ مقالات کو نسبتاً جامع بنانے کے لیے خود مولانا مرحوم اور ان بعض معاصرین کی تحریروں کو شامل کر لیا گیا، جو مطبوعہ تو ہیں مگر عام قارئین کو ان تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس مجموعے میں مولانا مرحوم کے چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکاتیب کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے ۲۰۰۲ء میں اس مجموعۂ مقالات کو شائع کیا، جس کی ترتیب و تدوین جناب ڈاکٹر سفیر اختر نے کی۔ یہ مقالات اردو زبان میں شائع کیے گئے۔[۷۴]

کتاب کے آغاز میں مرتب نے مولانا ابو الحسن علی ندوی کے بارے میں سید سلیمان ندوی، عبد الماجد دریابادی اور محمد منظور نعمانی کے ستائشی کلمات درج کیے ہیں۔ مجموعۂ مقالات کا افتتاحیہ جناب خورشید احمد نے تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے ادارہ تحقیقات اسلامی کی کاوشوں کو بالعموم اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کی کاوشوں کو بالخصوص سراہا ہے کہ انھوں نے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی یاد میں سیمینار کا اہتمام کیا۔ بعد ازاں انھوں نے مولانا کے ساتھ اپنے ذاتی تعلق کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک مولانا ان کے استاد، محسن اور مربی کا درجہ لکھتے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ دانش ور اور صاحب دل مربی تھے۔ اسی وجہ سے انھیں بیسویں صدی کے متعدد اہل نظر اور احباب دعوت میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔[۷۵]

مرتب و مدون نے مجموعۂ مقالات میں مولانا مرحوم پر لکھے جانے والے مقالات کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سترہ مقالات کو شامل کیا ہے۔ مقالات کے پہلے حصے میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے حالاتِ زندگی، خاندان، تربیت، تعلیم، تدریسی و دعوتی زندگی، علمی و تصنیفی زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس سلسلے میں مرتب نے سید ابو الحسن علی ندوی کی اپنی تحریر "میری علمی اور مطالعاتی زندگی" اور سید رضوان علی ندوی کی تحریر "مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ۔۔۔ سوانحی خاکہ" کو شامل کیا ہے۔ ان تمام مقالات میں

۷۳۔ سفیر اختر، مرتب، **مولانا سید ابو الحسن ندوی حیات و افکار کے چند پہلو** (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۱۵ء)، ۱۱۔

۷۴۔ نفس مصدر، ۱۲۔

۷۵۔ نفس مصدر، ۱۴۔

مولانا کی تصانیف کا مختصر تعارف اور ان کا اسلوب تحریر بیان کیا گیا ہے، جس سے ان کے طرزِ فکر اور خیالات و نظریات کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔

تیسرے حصے میں تین مقالات ،"ایک سچا داعی اسلام"از خالد علوی، "مولانا علی میاں کا پیغام امت مسلمہ کے نام"، از طفیل ہاشمی اور "اسلام کی تجدید واحیا کیسے ممکن ہے"از حبیب الرحمٰن عاصم کو شامل کیا گیا ہے۔ ان مقالات سے مولانا علی میاں کی شخصیت کے توازن و اعتدال، اسلاف سے حسنِ عقیدت، معاصرین کے ساتھ تعلقات میں تواضع و اعتراف، عناصر اور جماعتوں کے سلسلے میں ان کے حسن ظن اور جمع بین الاضداد کی قوت و صلاحیت جیسے نمایاں اوصاف کے بارے میں گفت گو کی گئی ہے۔

چوتھے حصے میں پانچ مقالات "مولانا علی میاں بحیثیت ادیب"، از خورشید رضوی، "عرب دنیا، عربی زبان وادب اور مولانا علی میاں "از سہیل حسن، "مولانا ابو الحسن علی ندوی: ایک روحانی شخصیت "از فضل الرحیم ، "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے "از محمد الغزالی اور "مولانا علی میاں اور پاکستان "، از زاہد منیر عامر کو شامل کیا گیا ہے۔ ان مقالات کو پڑھنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مولانا ابو الحسن ندوی ایک بالغ نظر ، روشن خیال اور وسیع النظر مفکر اور روحانی بزرگ تھے، جنھوں نے مختلف زاویوں سے ذاتی اصلاح پر زور دیا۔

کتاب کا پانچواں حصہ مکاتیب پر مشتمل ہے جس میں ان چند مکتوبات کو شامل کیا گیا ہے جو مولانا نے سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، سید رئیس احمد جعفری، مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ کو تحریر کیے۔ الغرض مجموعۂ مقالات مولانا کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس کی وجہ سے مرتب کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی درج کیا گیا ہے۔

مرتب نے "میری علمی اور مطالعاتی زندگی" کے عنوان سے سید ابو الحسن علی ندوی کے اپنے خطبات اور تحریروں کو جگہ دی ہے۔[۷۶] زیر نظر مضمون میں مولانا نے اپنے خاندان کے ماحول، علمی ذوق اور مشاغل کا مختصر تعارف کرایا ہے چوں کہ دادا صاحب اور والد صاحب جید عالم اور اردو اور عربی کے ادیب و نقاد بھی تھے، لہذا بچپن میں جن کتابوں کا مطالعہ کیا آج بھی ان کا نقش ذہن پر ثبت ہے۔ آغاز میں مولانا نے ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے

۷۶- نفس مصدر، ۱۵۔

جنھوں نے طالب علمی کے ابتدائی دور میں ان کو متاثر کیا، جن میں مولوی اسماعیل صاحب کا اردو نصاب "تکمک اردو"، "سوادِ اردو" اور "سفینہ اردو" شامل تھا۔ انھی دنوں آپ نے قاضی سلیمان صاحب کی **سیرت رحمۃ للعالمین** مولانا شبلی کی **الفاروق** اور مولوی محمد حسین آزاد کی **نیرنگ خیال** کا مطالعہ کیا۔ ابتداے شباب میں جن کتابوں سے استفادے کا موقع ملا ان میں محمد بن نصر المروزی کی **قیام اللیل** احمد امین کی **فجر الإسلام** سید سلیمان ندوی کی **خطبات مدراس**، مولانا مناظر احسن گیلانی کی **النبی الخاتم**، شاہ ولی اللہ کی **ازالۃ الخفاء**، **حجۃ اللہ البالغۃ**، **الفوز الکبیر في أصول التفسیر** اور سید احمد شہید کی **ملفوظات** ہیں۔ بعد میں محمد اسد کی *Islam at the Crossroads* سے بھی متاثر ہوئے۔(۷۷) اس مقالے کا اسلوب واقعاتی اور سوانحی ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کی فکر کا ارتقا کس طرح سے ہوا۔ مولانا کے بہ قول جن شخصیات نے ان پر گہرا اثر ڈالا ان میں اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال اور سید احمد شہید ہیں۔(۷۸)

دوسرا مقالہ "مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ۔۔۔ سوانحی خاکہ" کے عنوان سے سید رضوان علی ندوی نے تحریر کیا ہے۔ جس کے آغاز میں آپ نے علی میاں کے بزرگوں اور ان کی ابتدائی بنیادی تعلیم اور اس سے متعلق دل چسپ واقعات تحریر کیے ہیں۔ ساتھ ہی ان شیوخ کا ذکر بھی کیا ہے جن سے آپ نے مختلف اوقات میں زبانوں اور علوم و فنون کا علم حاصل کیا۔(۷۹) اس مقالے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا انتہائی کثیر الاسفار شخص تھے۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۹۹ء کے وسط تک آپ کے یہ سفر جاری رہے۔(۸۰) اس تحریر سے مولانا کی شخصیت کا ایک منفرد پہلو سامنے آتا ہے کہ وہ مربی، مزکی اور داعی ہونے کے ساتھ ساتھ دردمند قائد ملت بھی تھے۔ اس مقالے کا اسلوب بھی واقعاتی اور سوانحی ہے۔ الغرض زیر نظر مجموعۂ مقالات مولانا کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس کی وجہ سے مرتب کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔

کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی درج کیا گیا ہے۔

۷۷- مرتب نے مقالے کے شروع اور درمیان میں آپ کے خطبات اور تحریر کے بارے میں معلومات بیان کی ہیں۔

۷۸- سفیر اختر، مرجع سابق، ۴۱، ۴۶، ۴۷۔

۷۹- مرجع سابق، ۵۱۔

۸۰- مرجع سابق، ۸۶۔

سکون کی تلاش (سوانح حیات علامہ عبداللہ یوسف علی رحمۃ اللہ علیہ)

مصنف : ایم اے شریف

مترجم : زبیر بن عمر

نظر ثانی : افضل اقبال

صفحات : ۴۲۵

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں تاریخی ترتیب سے عبداللہ یوسف علی کی ذاتی اور عوامی زندگی کی تفصیل ہے۔ دوسرے حصے میں ان موضوعات، مقاصد اور دل چسپیوں کا ذکر ہے جو ان کے مشاغل اور تحریر و تقریر کا مرکزی نقطہ رہے تھے۔ کتاب میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔ یہ ضمیمہ ان کی مطبوع تحریروں کی فہرست ہے۔ اس میں وہ تبصرے بھی شامل ہیں جو ان کی تحریروں پر ان کو موصول ہوئے تھے اور ساتھ ہی ان کی وفات پر جو تعزیتی کلمات کہے یا لکھے گئے، شامل کیے گئے ہیں۔

حصہ اول کو مزید چھے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصۂ دوم (مساعی جلیلہ) کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سو اس کتاب کے کل دس ابواب میں مصنف نے عبداللہ یوسف علی کی زندگی، تعلیمی اور سیاسی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ کتاب کے آخری صفحات میں عبداللہ یوسف علی کی کچھ دستاویزات اور تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ کتاب میں تفصیلی حوالہ جات اور اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کے حرف اول سے کیا گیا ہے جس میں انھوں نے عبداللہ یوسف علی کے ترجمۂ قرآن کی ذکاوت و شگفتہ بیانی کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ جب انھیں عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ قرآن مع حواشی پڑھنے کا موقع ملا تو کس طرح سے ترجمہ ان کے قلب و ذہن پر چھا گیا اور ایک ایک لفظ نے ان کے قلب و ذہن میں تلاطم پیدا کر دیا۔ عبداللہ یوسف علی کی کچھ قرآنی سورتوں کا ترجمہ بہ طور مثال بھی پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے مصنف کی عبداللہ یوسف علی کی زندگی پر کی گئی تحقیق و مطالعہ اور کاوشوں کو سراہا ہے۔ ایم اے شریف نے عبداللہ یوسف علی کی شخصیت کو عیاں کرنے کے لیے مختلف ماخذ و مراجع سے رجوع کیا اور انھیں کھنگالا ہے۔

کتاب کے عنوان پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ عنوان خاص اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ یہ ان کی عائلی، ادبی اور سیاسی شخصیت کو اجاگر کرتا ہے اور قرآن کی طرف ان کے رجحان کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

باب اول کا عنوان صورت گری ہے جس میں محقق نے عبد اللہ یوسف علی کی پیدائش، نام کی مختلف جگہ تبدیلی، ان کی ابتدائی تعلیم، کالج اور بعد ازاں انڈین سول سروس میں شمولیت جیسے واقعات شامل کیے ہیں۔

ان واقعات میں محقق نے اس امر کو بہ خوبی ثابت کیا ہے کہ عبد اللہ یوسف علی انتہائی ذہین اور محنتی طالب علم تھے جو تعلیمی میدان میں سر فہرست رہے۔ محقق نے ان کی انڈین سول سروس میں شمولیت کو ان کی ذہانت کے ثبوت کے طور پر بیان کیا ہے۔ مصنف نے اس باب میں عبد اللہ یوسف علی کے برطانیہ سے احترام کے رشتے کو بھی اجاگر کیا ہے جس کا ذکر وہ کتاب میں بارہا کرتے نظر آتے ہیں۔

باب دوم جس کا عنوان "الجھنیں اور پریشانیاں" ہے عبد اللہ یوسف علی کی ملازمت پر تقرری اور ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس باب میں محقق نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عبد اللہ یوسف علی کی ایک برطانوی خاتون سے شادی ان کی جرأت مندانہ شخصیت اور روشن خیالی کا ثبوت ہے، کیوں کہ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس باب میں ان کی تعلیمی اور ادبی خدمات کو جو مقالوں اور لیکچرز کی صورت میں تھے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم جس کا عنوان "تاج برطانیہ کے لیے خدمات" ہے عبد اللہ یوسف علی کی تاج برطانیہ کے لیے ان کی خدمات، بے جا وفاداری اور برصغیر میں پیش آنے والے تاریخی حالات و واقعات کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ محقق نے بہت سے مقامات پر عبد اللہ یوسف علی کا موازنہ تحریک خلافت کے بانیوں سے کیا ہے اور ان کے فکری اور نظریاتی فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کی دوسری برطانوی خاتون سے شادی اور سابقہ بیوی کے بچوں سے تعلقات کی کشیدگی بیان کرنے سے محقق نے ان کی خاندانی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

باب چہارم کا عنوان "ہمہ جہت شخصیت" ہے جو ان کے مختلف علاقوں میں منصب ہائے اعلیٰ پر تعیناتی اور ان کی تدریسی سرگرمیوں کی تمام تفصیلات کو بیان کرتا ہے۔ وہ تدریسی اداروں کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۱-۱۹۲۸ء تک بہت سے مناصب پر فائز رہے۔ محقق نے اس باب میں یہ بات عیاں کی ہے کہ عبد اللہ یوسف علی اپنی حساس طبیعت کے باعث کسی کام کو مکمل طور پر سر انجام نہ دے سکے۔

باب پنجم جس کا عنوان "جنیوا سے لاہور" ہے ان کی برطانیہ کے لیے پروپیگنڈے کے کاموں سے مزید روشناس کرواتا ہے۔ محقق نے عبد اللہ یوسف علی کی تاج برطانیہ کی نظر میں اہمیت کو اس امر سے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کی نمائندگی کے لیے عبد اللہ یوسف علی کو لیگ آف نیشنز کی اسمبلی کے لیے وفد میں شامل کیا گیا جس سے

مصنف نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ یقیناً برطانیہ کو ایسے لائق شخص کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی جو پالیسیوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں مؤثر کردار ادا کر سکے۔ اسی باب میں ان کی دوسری بیوی سے بیٹے راشد کا بھی ذکر ہے اور مزید ان کے تعلیمی کارناموں اور ادبی سرگرمیوں کو پوری تحقیق سے درج کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں شروع ہونے والے قرآن کی تفسیر و ترجمے کے کاموں کی تمام تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔

باب ششم بہ عنوان "ایک مضطرب روح" میں محقق نے ۱۹۳۷ء-۱۹۷۶ء تک دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات، برطانوی بادشاہت کی شہرت میں ہونے والی کمی اور عبد اللہ یوسف علی کی برطانیہ اور لیگ سے جڑی ہوئی بے انتہا اعتماد اور وفاداری کی ٹوٹی امیدوں کا ذکر کیا ہے۔ عبد اللہ یوسف علی کی فلسطین کی تقسیم کی مخالفت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جو ان کی سیاسی خدمات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کی عائلی زندگی کی پریشانیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ مصنف نے اس باب میں عبد اللہ یوسف علی کے اضطرابِ طبع اور سیمابیت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آخری ایام میں ان کے ذہنی انحطاط اور ان کی حالت زار کی ایک افسوس ناک منظر کشی کی گئی ہے جس میں ان کی وفات کے حوالے سے بھی تفصیلات درج ہیں۔

حصۂ دوم کے باب ہفتم "تعلیمی مقاصد اور اہداف" میں ان کی تمام تعلیمی، ادبی اور تدریسی خدمات کو یک جا کیا گیا ہے جس میں ان کی تمام خدمات درج ہیں۔

باب ہشتم "ایک ہم آہنگ اور منظم دنیا"، عبد اللہ یوسف علی کی شخصیت کے کلاسیکیت پسند شخص ہونے کو بیان کرتا ہے اور مشرق و مغرب کے درمیان خوش گوار اتحاد و یک جہتی کا قائل نظر آتا ہے۔

باب نہم "قرآن بطور ہدایت"، میں محقق نے عبد اللہ یوسف علی کی ابتدائی زندگی، تجربات، جذبات، امنگوں اور نظریاتی وابستگی کو قرآن کے نقطۂ نظر سے مطالعے کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ان کی قرآن کے ترجمے اور تفسیر سے متعلق تمام تفصیلات اس باب میں محقق نے بیان کی ہیں۔

باب دہم "اختتامیہ" میں محقق نے عبد اللہ یوسف کی شخصیت کو بہت ہی مختصر لیکن جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے نظریے، ان کی زندگی کے مقصد، ان کے اقبالؒ سے نظریاتی تضاد کو پیش کر کے ان کی شخصیت کے مختلف ہونے کی عکاسی کی ہے۔ ان کی ذہنی کشمکش اور قلبی و ذہنی انتشار کی وجوہات پر دوبارہ سے روشنی ڈالی ہے، لیکن ثابت یہی کیا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد تعلیم سے جڑا ہوا تھا۔

زیر نظر کتاب میں محقق نے بیانیہ طرز تحقیق کے ساتھ تجزیاتی طریقۂ تحقیق بھی اپنایا ہے۔ محقق نے بہت تفصیل سے تاریخی واقعات کو پیش کیا ہے اور ان ہی واقعات کے ساتھ عبد اللہ یوسف علی کی زندگی کو منسلک کر

کے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ محقق نے جہاں بھی ان کی شخصیت کا کوئی پہلو بیان کیا ہے اس کا حوالہ اس پیش آنے والے واقعہ سے دیا ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے، جیسے عبد اللہ یوسف کی برطانیہ سے غیر معمولی وفاداری کو کتاب میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ پیش آنے والے تاریخی واقعات کی روشنی میں اسے ثابت بھی کیا ہے۔

محقق نے ان کی عائلی زندگی بہت تفصیل سے بیان کی ہے، جس میں ان کی دو شادیاں، بچوں کی پیدائش، ان کے ناموں کا ذکر اور ان کی رہائش کی تفصیل بھی شامل ہے۔

محقق نے عبد اللہ یوسف علی کی شخصیت کو ایک تعلیمی اور ادبی شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے، ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی بیان کی گئی ہیں لیکن ان واقعات سے ایک علمی شخصیت ہی قارئین کے ذہن میں اجاگر ہوتی ہے اور شاید یہی اس کتاب کا مقصد بھی نظر آتا ہے۔

بہت سے مقامات پر عبد اللہ یوسف علی کی برطانیہ سے بے جا وفاداری کو مصنف بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس کا مقصد تنقید کے بجائے ان کی شخصیت کے باقی مسلمان رہ نماؤں سے مختلف ہونے کی دلیل ملتی ہے اور مقصد ان کی ذات کے پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہی لگتا ہے۔

کتاب کے عنوان اور عبد اللہ یوسف علی کی شخصیت میں گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ محقق بہت کام یابی سے ان کی حساس طبیعت، پیچیدہ خاندانی تعلقات، ایک مضطرب قلب و ذہن رکھنے والی شخصیت اور قرآن کے ترجمہ و تفسیر میں سکون تلاش کرنے کی تمام کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات کتاب کے عنوان کو موضوع ثابت کرتی ہیں۔

غرض یہ سوانح حیات نہ صرف عبد اللہ یوسف علی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، بلکہ ہندوستان کے تاریخی واقعات کو بھی بہت ہی تفصیل سے بیان کرتی ہے؛ چناں چہ یہ کتاب نہ صرف عبد اللہ یوسف علی کی علمی، ادبی، تدریسی اور سیاسی خدمات اور کارناموں کو جاننے کا بہترین ذریعہ ہے، بلکہ تاریخ میں دل چسپی رکھنے والے قارئین کے لیے ایک عمدہ ذخیرہ بھی ہے۔

عبد اللہ یوسف علی کی شہرت کا باعث یقیناً ان کا قرآن کا انگریزی ترجمہ و تفسیر ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو انگریزی میں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کے حوالے سے عبد اللہ یوسف علی کا نام نہ جانتا ہو لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے اس کارنامے کو جاننے والے لوگ بھی ان کی ذاتی زندگی اور دیگر ادبی خدمات سے سراسر

ناواقف تھے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ محقق نے عمدگی اور شائستگی سے عبداللہ یوسف علی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ محقق کے تفصیلی حوالہ جات ان کی تحقیق کی پائداری، محنت اور جامع تحریر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

یہاں مترجم کی اگر تعریف نہ کی جائے تو شاید اس کتاب کے ساتھ انصاف نہ ہوگا، کیوں کہ یہ کتاب اصل میں انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن کتاب کے اردو ترجمے کو پڑھنے کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کی کتاب کی خوب صورتی کو مترجم نے اس ترجمے میں بحال رکھا ہے اور قاری کے لیے یہ ویسی ہی دل چسپی کا باعث ہے۔

The Muslim Luminaries Leaders of Religious, Intelletral & Political Revival in South Asia

ناشر : نیشنل ہجرہ کونسل، اسلام آباد

تاریخ اشاعت : ۱۹۸۸ء– ۱۴۰۸ھ

صفحات : ۴۰۲

اس کتاب کا حرف اوّل این اے بلوچ نے تحریر کیا ہے جو کونسل کے مشیر تھے۔ اس کتاب کی تدوین ہجرہ کونسل کے مقاصد کی عکاس ہے، جو کہ اسلام کے تاریخی کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے کونسل نے شمالی ایشیائی برصغیر کے نام ور رہ نما اور فقہا کی سوانح حیات ترتیب دینے کے لیے متعدد نام ور شخصیات کو یہ کام سونپا جن میں کونسل کے چیئرمین اے۔کے بروہی بھی شامل تھے جو کتاب کی تدوین سے پہلے وفات پاچکے تھے۔ ان کے مضمون پر این۔اے بلوچ نے نظر ثانی کی ہے۔

اس کتاب میں گیارہ نام ور شخصیات کے علمی و ادبی، مذہبی اور سیاسی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمام رہ نما شمالی ایشیائی برصغیر سے تعلق رکھنے کے ساتھ دیگر بہت سی خصوصیات میں ہم آہنگ ہیں اور یہی اس کتاب کو مرتب کرنے کا مقصد بھی دکھائی دیتا ہے کہ ایسے تمام غیر معمولی اشخاص کا ایک جگہ تفصیلاً ذکر کیا جائے جو قارئین کے لیے تاریخی وادبی دونوں لحاظ سے سود مند ثابت ہوں۔

شیخ احمد سرہندیؒ: برہان احمد فاروقی

سب سے پہلا مقالہ شیخ احمد سرہندیؒ کے بارے میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے تحریر کیا ہے، جنھیں مجدد الف ثانی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کے آغاز میں مجدد الف ثانی کی پیدائش اور مغل بادشاہ اکبر کے

دورِ حکومت میں اسلام کی زوال پذیری اور اس دور میں ان کی بہ طور عالم دین خدمات کو بیان کیا ہے۔ مضمون کے پہلے حصے میں مجدد الف ثانیؒ اور ابن العربیؒ کے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریاتی اختلاف کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

بادشاہ اکبر اور جہانگیر کے ادوار میں انھوں نے بہت سے صعوبتیں بھی برداشت کیں، کیوں کہ وہ بادشاہِ وقت کے غیر اسلامی روایات واقدامات کی شدید مخالفت کرتے رہے جس کی وجہ سے قید وبند کی اذیتیں بھی جھیلیں لیکن اپنے مقصد کو فراموش نہ کیا۔ محقق نے اس حقیقت کو تحریر کیا ہے کہ مجدد الف ثانیؒ جیسے مجتہد کی کاوشوں کی وجہ سے ہی برصغیر میں اسلام دوبارہ زندہ ہوا۔ یہ مختصر مضمون بہت ہی خوش اسلوبی سے مجدد الف ثانیؒ کی طویل جدوجہد کو مختصر اور بااثر انداز میں پیش کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ: غلام نبی جلبانی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سوانح حیات، پروفیسر جی این جلبانی نے تحریر کی ہے۔ ابتدائی حصے میں ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کا بیان ہے جو انھوں نے اپنے علم و عمل کے جامع والد سے حاصل کی۔ مصنف نے ان کی تدریسی مہارت اور طریقۂ اسلوب کو تفصیلا بیان کیا ہے جو دینی تعلیم سے وابستہ علما کے لیے رہ نما اصول ہیں۔ اس مضمون میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات سے متعلق معروف علما شاہ ولی اللہؒ سے رہ نمائی حاصل کرتے تھے۔ جو اہم نکتہ اس مضمون میں واضح کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے قرآن کی تعلیم پر بہت توجہ دی اور قرآن کے لفظی معانی پر انحصار کیا۔ شاہ ولی اللہؒ کے ماموں حنفی جب کہ والد امام شافعیؒ کے مقلد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے دونوں فقہوں کا مطالعہ کیا اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے قائل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے طلبہ کو تعلیم و تربیت دینے میں دونوں مسالک کے اصول سمجھائے اور وہ ایک مجتہد کے طور پر امام شافعیؒ کے پیروکار نظر آتے ہیں لیکن جہاں دونوں مسلکوں میں تضاد پایا جاتا ہے وہ احادیث پر انحصار کرتے تھے جو دلیل اور سند کے اعتبار سے مستند ہوتیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے دور میں برصغیر کے معاشی، سیاسی اور مذہبی حالات زوال پذیری کا شکار رہے۔ اس میں شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی، مذہبی اور معاشرتی خدمات پر سادہ، جامع اور پر اثر نکات تحریر کیے ہیں۔

تصوف پر شاہ ولی اللہؒ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ فنا و بقا کی کیفیات پر یقین نہیں رکھتے تھے، کیوں کہ قرآن سے اس کی کوئی دلیل ثابت نہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے قرآن کا فارسی ترجمہ بھی کیا اور حدیث کی کتابوں کی سند

کے لحاظ سے ترجیحات پر بھی کام کیا۔ شاہ ولی اللہؒ نے جہاد اور انقلاب کو ایک ہی معانی میں سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی پیراے میں بیان کیا ہے۔ غرض ان کی تعلیمات کو محقق نے بہت جامع انداز میں پیش کیا ہے جو ان کی علمی، سیاسی اور مذہبی تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔

سرسید احمد خان: محمد یوسف عباسی

سرسید احمد خان کے بارے میں تحریر کردہ مضمون پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف عباسی نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے دیگر مقالات کی طرح یہ بھی سرسید احمد خان کی علمی و ادبی اور سیاسی جدوجہد پر نظر ڈالتا ہے۔ سرسید کا شمار بلاشبہ برصغیر کے ہمہ جہت مسلم رہ نماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے انھیں اپنے حق کے لیے کھڑا کیا۔ اس مضمون میں ان کی ابتدائی تعلیم سے لے کر ان کے تمام مناصب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات انھوں نے اپنی تحریر "تاریخ سرکشی بجنور" میں قلم بند کیے۔ اسی سال "رسالۂ بغاوت ہند" بھی لکھا، جو ان کے احباب نے شائع کرنے سے منع کیا، کیوں کہ ان کے نزدیک اس کی اشاعت کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ سرسید نے اس بغاوت کی وجہ برطانیہ کی اپنی پالیسیوں کے نتائج سے لاعلمی اور برصغیر کی رعایا سے دوری بتایا جو تمام فسادات کی جڑ بنی۔ یہ رسالہ انگریزی میں اشاعت کے بعد پارلیمانی حلقوں میں نہایت دل چسپی کا باعث بنا اور ہندوستان کے لیے پالیسی کی از سر نو تشکیل میں انگریزوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

مصنف نے سرسید احمد خان کی شخصیت کی عکاسی ایک جان فشاں رہ نما کی حیثیت سے کی ہے جو مسلمانوں اور اسلام کے خیر خواہ تھے۔ ۱۸۶۰ء میں انھوں نے *The Loyal Muhammadens of India* کے نام سے رسالہ شائع کیا تاکہ مسلمانوں کی وفاداری اور تعاون کا انگریزوں کو یقین دلایا جا سکے۔ سرسید نے قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام دوسرے مذاہب کے لوگوں سے دوستی اور امن کا پیغام دیتا ہے جس سے مصنف نے ان کی روشن خیالی کو ظاہر کیا ہے۔ اس مضمون میں قابل ذکر بات **علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ** ہے جس میں پریس کی آزادی پر زور دیا گیا ہے۔ سرسید نے ایم او کالج علی گڑھ کی بنیاد رکھی، جو ان کا ایک اور تدریسی کارنامہ ہے۔ صفحہ ۶۸ پر ان کے سیاسی رجحانات کے کئی اہم پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ جو ان کی امن پسند سیاسی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں، لیکن برصغیر کے بدلتے سیاسی حالات نے انھیں سول سروس کے خلاف تحریک چلانے پر مجبور کیا۔

مضمون کے تیسرے حصے میں سر سید احمد خان نے جداگانہ مسلم نمائندگی کی بھی حمایت کی۔ اپنے اس نظریے کو لوکل سلف گورنمنٹ کے بل میں پیش کیا۔ مضمون کے چوتھے حصے میں مصنف نے سر سید احمد خان کی کانگریس کے خلاف تحریک کے آغاز کا ذکر کیا ہے جس میں سر سید کے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ کانگریس مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی سلسلے میں سر سید نے United Indian Patriotic Association تشکیل دی جو اپنی نوعیت کی پہلی ایسوسی ایشن تھی، سر سید اس ایسوسی ایشن کے قیام سے مسلمانوں کو متحرک کرنے میں کافی کامیاب رہے۔

سید امیر علی: محمد یوسف عباسی

سید امیر علی کا مقالہ بھی پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف عباسی نے تحریر کیا ہے جو کہ تحریر کے انداز میں پہلے مضمون سے مشابہت رکھتا ہے۔ سید امیر علی ایک وکیل اور آئینی تجزیہ نگار تھے۔ اپنے ہم عصر مسلم رہ نماؤں کی طرح وہ جداگانہ مسلم نمائندگی اور شناخت کے حامی تھے۔ اس مضمون میں ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

مضمون کے پہلے حصے میں ان کی تعلیم و تربیت کی تفاصیل ہیں بعد ازاں محقق نے مضمون کے چھے حصّوں میں ان کی سیاسی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس میں The Spirit of Islam انگریزی زبان کی سب سے پہلی کتاب تھی جو کسی مسلمان نے اسلام کے بارے میں تحریر کی۔ اس کے علاوہ رسول کریم ﷺ پر انھوں نے جو کتاب لکھی اس کا بھی حوالہ دیا گیا ہے: *The Spirit of Islam*؛ نوجوان نسل کے لیے ایک بہترین علمی کوشش ہے۔

امیر علی کے سیاسی نظریے اور ان کے ہم عصر دوسرے رہ نماؤں کے سیاسی نظریے کے اختلاف کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان کی سیاسی خدمات میں ان کے کردار کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جس کا مقصد قانونی اور آئینی لحاظ سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا۔ یہ امر محقق نے ان کے اچھے وکیل ہونے اور ان کی شخصیت اور سوچ پر اثر انداز ہونے والے امر کی حیثیت کو بیان کیا ہے۔ غرض کہ اس تحریر کے ذریعے امیر علی کی سیاسی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔

محمد علی جناحؒ: پروفیسر شریف المجاہد

محمد علی جناح نامی مقالہ پروفیسر شریف المجاہد نے تحریر کیا ہے۔ محقق نے محمد علی جناح کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے احوال مختصر بیان کیے ہیں اور ان کی سیاسی خدمات پر زیادہ روشنی ڈالی ہے ۔ یہ مضمون ان کے سیاسی

کارناموں اور ان کی مستقل مزاجی، دور اندیشی اور ذہانت کا بیان ہے۔ محقق نے اس مضمون کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلے حصے میں ان کی تعلیم، خاندان، انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اور ان کے دیگر مناصب اعلیٰ کا ذکر کیا ہے۔ یہ تمام تفصیلات یہ بات ظاہر کرتی ہیں کہ جناح شروع ہی سے قائدانہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اسی حصے میں ۱۹۰۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت سے لے کر لکھنو، جنگ عظیم اول میں ہندوستان کے سیاسی میدان میں رونما ہونے والے تمام واقعات درج ہیں۔ دوسرے حصے میں محمد علی جناح کی کانگریس سے علاحدگی اور ہندو مسلم الحاق کے حامی ہونے سے متعلق تمام تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کی تجویز کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے تعصب اور نہرو رپورٹ جس نے جناح کو ہندو ذہنیت سے آشکار کیا، کی تفصیل بھی درج ہے۔ تیسرے حصے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، جس سے ہندوؤں کا ایجنڈا کھل کر سامنے آیا، کی تفصیلات ہیں جس نے جناح کو مسلم لیگ کانفرنس میں نئے سرے سے بنیاد رکھنے پر مجبور کیا تاکہ مسلمانوں کو متحد کیا جا سکے اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ ملک کے قیام کا مطالبہ بھی سامنے آ گیا۔ غرض ۱۹۳۷ء-۱۹۴۷ء تک کے تمام اہم واقعات درج کیے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی میں پیش آنے والے مصائب، مشکلات اور ہجرت کی تکالیف کا حوالہ دیا گیا ہے اور ان تمام حالات میں جناح نے مسلمانوں کو جس طرح رواداری، اخوت و اتحاد کا پیغام دیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ مسلمانوں کے لیے جناح کا جو مقام بنا وہ مثالی تھا۔ محقق نے اتاترک کے ساتھ جناح کا موازنہ بھی کیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکستان کا وجود جناح کا مرہون منت ہے، آزادی کی جدوجہد بہت سے رہنماؤں نے کی ہے، لیکن جناح جیسے لیڈر بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی حصے میں ان کی وفات کا بھی ذکر ہے اور ان کے بارے میں مختلف شخصیات کے تعریفی کلمات بھی درج ہیں۔ آخری حصے میں محقق نے جناح کی اسلام سے وابستگی کو ظاہر کیا ہے ان کی تقاریر سے مختلف حصے بھی شامل کیے ہیں، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جناح ہر لحاظ سے اسلام کو مکمل ضابطہ ٔ حیات تصور کرتے تھے اور پاکستان کی بنیاد اسلام کے اصولوں پر رکھنے کے حامی تھی، کیوں کہ ان کے نزدیک اسلام ہی مسلمانوں کی شناخت اور پاکستان کے وجود کی بنیاد ہے۔

عنایت اللہ خان المشرقی: سید شبیر حسین

عنایت اللہ خان، جنھیں علامہ مشرقی کے نام سے جانا جاتا ہے، کی برصغیر میں مسلمانوں کی خدمات کے بارے میں سید شبیر حسین نے یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ علامہ مشرقی کے والد کے سرسید احمد خان اور دوسرے

مسلمان رہ نماؤں کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ علامہ مشرقی سات سال کی عمر ہی سے اپنے والد کے ساتھ جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ محقق نے اس بات سے ان کے سیاسی شعور کی عکاسی کی ہے۔

علامہ مشرقی انتہائی ذہین طالب علم تھے۔ انھوں نے تعلیمی میدان میں شروع ہی سے نمایاں کارکردگی دکھائی۔ کیمبرج یونی ورسٹی میں انھوں نے نئے ریکارڈز قائم کیے۔ پانچ سالوں میں انھوں نے چار Triposes آنرز کے ساتھ مکمل کیے جو کسی طالب علم نے آج سے پہلے نہیں کیے۔ یہ ان کی ذہانت و فطانت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ علامہ مشرقی کو سائنس سے دل چسپی تھی اور سائنس کے مشاہدات کو قرآن کی روشنی میں پرکھا۔ انھیں بہ طور وی پی اسلامیہ کالج پشاور میں عہدہ دیا گیا۔ ان کا سب سے اہم اور نمایاں کام ان کی کتاب **تذکرہ** ہے۔ جس میں انھوں نے خدا کے حکم اور خدا کے کام *"Word of God & Work of God"* کے تعلق کو بیان کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب مغربی مفکروں کے لیے ایک دھچکا تھی۔ محقق نے **تذکرہ** کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ علامہ مشرقی کی یہ کتاب مذہب کو سائنس کے طور پر پیش کرتی ہے۔ محقق نے کتاب کی پذیرائی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بہت سے بین الاقوامی علمانے اسے سب سے کام یاب اور عالم گیر قانون قرار دیا ہے۔ علامہ مشرقی کا کہنا ہے کہ سائنس دان قرآن کا سائنس کے مضمون کی طرح مطالعہ کریں اور اس کے اسرار و رموز کو عیاں کریں اور اس کا تجزیاتی مطالعہ کریں۔ یہ تجویز انھوں نے بہت سے مسلمان لیڈروں کو دی، لیکن کسی نے اس میں دل چسپی نہیں لی۔ علامہ کی *Einstein* سے ملاقات کا بھی ذکر ملتا ہے جس میں انھوں نے انسانیت کو نئی راہ دکھانے سے متعلق گفت گو کی۔

ان کی سیاسی خدمات میں ان کی تحریک ”خاکسار“ بہت نمایاں رہی جس میں ان کو جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ ان کی سیاسی جدوجہد کو بھی محقق نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آخر میں محقق نے علامہ مشرقی کے ارتقا کے نظریے کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو رد کیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے علامہ مشرقی کے بتائے گئے چار ستونوں کا ذکر کیا ہے جو کہ توحید، ختم نبوت پر ایمان، آخرت پر یقین اور قدرت پر یقین ہے۔ ان سب میں علامہ مشرقی کا کہنا ہے کہ صرف الفاظ سے پیروی نہیں، بلکہ عمل سے پیروی بھی ضروری ہے۔ علامہ مشرقی نے کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۹۶۳ء کو لاہور میں وفات پائی۔

محمد علی: افضل اقبال

ڈاکٹر افضل اقبال نے مولانا محمد علی کی ادبی اور سیاسی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم، والد کے اچانک انتقال اور اس کے بعد ان کی ایم اے او کالج اور آکسفرڈ یونی ورسٹی میں Modern History میں گریجویشن کا ذکر کیا ہے۔

محقق نے ان کے مزاج کی طبیعت کا حوالہ بھی دیا ہے اور یہ بات بیان کی کہ مولانا اپنی ترقی اور اصلاح پسند طبیعت کی وجہ سے قدامت پسند لوگوں میں زیادہ مقبول نہیں تھے۔

۱۹۱۱ء میں محمد علی نے Comrade رسالے کی بنیاد رکھی جو کہ ہندوستان کی صحافت میں ایک روشن ستارے کی طرح ابھرا۔ اس رسالے میں ہندوستان کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ اس رسالے نے Turkish Relief Fund کے لیے چندے کی اپیل بھی کی جس میں لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔

۱۹۱۳ء میں محمد علی نے کھل کر برطانیہ کی مخالفت کی جو ان کی جرأت مندی کو ظاہر کرتا ہے جس کی وجہ سے Comrade اور ہمدرد رسالوں کو برطانوی حکومت نے بند کر دیا اور اسی سلسلے میں پانچ سال قید میں بھی رکھا گیا جس میں انہوں نے قرآن کا مطالعہ کیا۔

انھیں اور ان کے بھائی کو جنگ عظیم اول میں ہندوستان نے جس طرح برطانیہ کے لیے فوجی بھرتی اور مالی مدد کی، اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ ترکی کی خلافت میں پیش آنے والے تمام واقعات کو قلم بند کیا ہے اور کس طرح ہندوستان میں تحریک خلافت میں مسلمانوں نے ایک کلیدی کردار ادا کیا۔

خلافت کانفرنس Trioty of Serves کا بھی ذکر ہے۔ تحریک خلافت کی محمد علی نے پرزور حمایت کی اور ان کی والدہ بھی (بی اماں) اس تحریک میں شامل تھیں۔ اس دوران میں انھیں قید تنہائی کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ وہ ۱۹۲۳ء میں جیل سے رہا کیے گئے۔ گول میز کانفرنس میں محمد علی نے مسلمانوں کی جداگانہ شناخت کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔

محقق نے انھیں ایک بہترین مدیر اور صحافی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد ان کی شخصیت بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ ان کے لباس پر بھی محقق نے اپنے خیالات بیان کیے ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ کے اختتام کے بعد بھی محمد علی نے مسلم اتحاد کے خواب کو فراموش نہ کیا۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال: جسٹس جاوید اقبال

ڈاکٹر محمد علامہ اقبال کا مضمون ان کے اپنے بیٹے جسٹس جاوید اقبال نے تحریر کیا ہے۔ مصنف چوں کہ ذاتی حیثیت سے محمد اقبال کو جانتے ہیں اس لیے ان کے مضمون میں دیگر مضامین کی طرح حوالہ جات نہیں درج کیے گئے ہیں۔

جاوید اقبال نے اس مضمون میں اقبال کے فلسفیانہ نظریات کی عکاسی کی ہے۔ اقبال کی شاعری کی خداداد صلاحیتوں سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ مصنف کے بہ قول انھوں نے اس فریضے کو اس طرح نبھایا جس طرح پیغمبر، خدا کے پیغام کو پھیلانے کے لیے اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے۔

مصنف نے اقبال کی لکھی گئی عظیم نظموں، ان کے زمانی حالات، ان کے آپس کے تعلق اور اس پر مذہب کے اثرات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقصد اقبال کے فلسفے کو مذہب سے منسلک کر کے دیکھنا ہے۔ مضمون میں انھوں نے اقبال کا موازنہ دیگر یورپین شعرا سے بھی کیا ہے اور برصغیر میں پیش آنے والے حالات اور ان سے جڑی نظموں کو اقبال کے نظریے کو سمجھانے کے لیے مصنف نے تحریر کیا ہے۔ اسی میں اقبال کے فلسفۂ انقلاب کو بھی بیان کیا ہے۔ مصنف نے اس بات کو بھی بیان کیا ہے کہ یورپ کے سیکولر ازم (لادینیت)، قوم پرستی، علاقائی حب الوطنی جیسے نظریات نے اقبال کی شاعری پر کس طرح اثر ڈالا اور انھوں نے مذہب کے حوالے سے ان سب نظریات کو اپنی شاعری کے ذریعے کس طرح بیان کیا۔

آخر میں مصنف نے اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ موجودہ پاکستان اقبال کے خواب کی ہلکی سی جھلک ہے، لیکن یہ ان کے خواب کی حقیقی تعبیر سے ابھی بہت دور ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی: ڈاکٹر محمد معز الدین

مولانا عبید اللہ سندھی کی خدمات پر ڈاکٹر محمد معز الدین نے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی پیدائش، ننھیال کے سکھ مذہب، والد اور دادا کی وفات اور ابتدائی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون اس لیے بھی دل چسپ ہے کہ مولانا نے تیسری جماعت میں اسلام قبول کیا۔ محقق نے ان کے اسلام قبول کرنے کی تفصیلات کو بہت ہی شگفتگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جن عناصر نے انھیں اسلام کی طرف راغب کیا؟ ان سب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد جن اساتذہ سے انھیں فیض یاب ہونے کا موقع ملا ان کو بھی تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ غرض مولانا ایک علمی، ادبی اور مذہبی شخصیت تھے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے ان کی مذہب اسلام سے محبت اور لگاؤ واضح ہے۔

اسلام قبول کر کے انہوں نے گھر کو خیر باد کہا، ان کی والدہ بارہا ان کا پتا ملنے پر انھیں واپس لے جانے پر اصرار کرتی رہیں، لیکن وہ دینِ اسلام کی راہ پر ایک سچے مجاہد کی طرح گام زن رہے اور قرآن کے مفسر کا درجہ حاصل کیا۔ محقق نے ان کی سیاسی جدوجہد کو بھی بیان کیا ہے، جو انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت بھی اختیار کی۔ محقق نے ان کی شخصیت ایک درویش کی سی بیان کی ہے جسے دنیاوی جاہ و جلال سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔ محقق نے انھیں ایک سچا مسلمان، مجاہد، مجتہد اور استاد کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ”مردِ مومن“ کا لقب دیا ہے جو قاری کے لیے بہت متاثر کن ہے۔

علامہ آئی آئی قاضی کی زندگی اور کام: اے۔ کے بروہی

مقالہ نگار اس مضمون میں امام علی قاضی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک ولی جیسی شخصیت تھے جو انسانیت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہوئے۔ اس مقالے میں بھی مصنف نے حوالہ جات تحریر نہیں کیے، کیوں کہ مصنف کا امام علی قاضی سے گہرا رشتہ اور تعلق رہا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت کو پچاس صفحات میں بھی بیان کرنا ناممکن ہے، اس لیے کہ وہ ایک ایسے شخص کے بارے میں بیان کر رہے ہیں کہ جو مجتہد، فقیہ اور عالم ہے اور جدید سوچ کا مالک ہے۔ مصنف نے ایسے شفیق انسان کے سائے میں دینی اور نظریاتی تربیت پائی۔ مصنف نے ان کی ایک کتاب کا حرفِ اول بھی تحریر کیا تھا جس کا حوالہ اس مضمون میں دیا ہے۔

علامہ قاضی کی زندگی کی بنیاد اسلام کے اصولوں، تعلیمات، حق اور ایمان داری کے اصولوں پر مبنی ہے۔ وہ ہمیشہ یہ دعا فرماتے: ”یا اللہ مجھے چیزوں کی اصل حقیقت سے آگاہی عطا فرما“۔

مضمون کے پہلے حصے میں ان کی ابتدائی زندگی اور تعلیم کا ذکر ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ معروف شعرا حافظ، رومی اور سعدی کی شاعری سے گہرا لگاؤ رہا۔ عربی بھی سیکھی اور لکھی۔ جمعے کی نماز کے خطبوں میں لوگ انھیں بہت ذوق اور شوق سے سنتے اور انھوں نے لوگوں کی زندگی پر اسلامی تعلیمات کا گہرا اثر چھوڑا۔ محقق نے ان کے خطبات کا ذاتی تجربہ پیش کیا ہے۔

وہ علامہ مشرقی سے بھی متاثر تھے اور ان کا یقین تھا کہ نوجوان نسل کے لیے علامہ مشرقی جیسے رہ نماؤں کی ضرورت ہے۔ علامہ قاضی ایک روحانی استاد تھے۔ محقق نے انھیں ذہانت کے بادشاہ کا خطاب دیا ہے۔ علامہ نے تصوف کی بھی بات کی ہے لیکن اس میں عقل کے پہلو کو ہمیشہ اجاگر کیا۔ علامہ قاضی نے علم کی اہمیت پر بہت زور

دیا۔ سورۃ القدر پر جو علمی گفت گو مصنف کے ساتھ ہوئی وہ بھی تحریر کی ہے۔ محقق نے ان کی زندگی کے کام کو چار موضوعات میں بیان کیا ہے: ۱۔ انسانی ترقی، ۲۔ تہذیب و تمدن، ۳۔ ثقافت، ۴۔ اسلام بہ طور انقلابی مذہب

مصنف نے ان چاروں موضوعات کو علامہ کی کتاب سے نقل کیا ہے۔ آخر میں اقبال اور رومی کا موازنہ کیا ہے اور قرآن کے طرز بیان پر بھی گفت گو کی ہے۔ یہ سب ان کی تصانیف سے نقل کیا گیا ہے۔

سب سے آخر میں ایک سندھی شاعر "رسالو" کی شاعری اور اس پر جدید تجزیہ نگاروں کے اعلیٰ شاعری کو پرکھنے کے اصول بیان کیے ہیں۔ ان کی تصانیف سے لی گئی یہ تحریریں ان کی سوچ اور فہم و فراست کو ظاہر کرتی ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: قاضی حسن منصور پوری

مصنف نے انھیں ایسے علما میں شمار کیا ہے جو لازوال اور لافانی ہوں۔ یہ مضمون ان کی سوچ، تحریک اور تصانیف کے علاوہ بنیادی طور پر ان کی تقاریر پر مبنی ہے۔ محقق نے ان کے طبعی خدوخال، حلیے اور لباس کو بھی بیان کیا ہے۔ محقق ان کو ذاتی طور پر جانتے تھے چناں چہ وہ خود بنیادی مصدر رہیں۔

ان کے والد کی صوفیانہ زندگی کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے جن کا شجرۂ نسب نبی اکرم ﷺ سے ملتا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے گھر ہی میں حاصل کی۔ سید مودودیؒ **مدینہ**، **تاج**، **ہمدرد** اور **الجمعیت** کے مدیر رہے۔

ان کی پہلی سیاسی سرگرمی "انجمن عنایت نظر بندانِ اسلام" کا قیام تھا۔ ان کی تصانیف کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جن میں **الجہاد فی الاسلام** وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سید صاحب کا ایک رسالہ **ترجمان القرآن** بھی شائع ہوتا تھا جس کے چار اہم نکات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودیؒ حکومتِ وقت کو آئین میں اسلامی قوانین کو شامل کرنے پر زور دیتے رہے۔ حکومت نے انھیں باغی قرار دیا اور اس سلسلے میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ انھیں سزاے موت بھی سنائی گئی۔

UDF کی تحریک کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو کہ گھیراؤ جلاؤ کی تحریک بھی کہلاتی ہے۔ سید مودودیؒ کی جماعت الیکشن میں خاصی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ ایوب اور یحییٰ کے مارشل لا کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

کینیڈا کی یونیورسٹی McGill میں پروفیسر چارلز جے ایڈم، جو کہ اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ تھے، نے یہ تجویز دی کہ سید ابو الاعلی مودودیؒ کی کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں، جو اسلام کے جدید اطوار کی عکاسی کریں۔

سید مودودیؒ نے قرآن کی تفسیر سے بھی شہرت حاصل کی جس کا نام **تفہیم القرآن** ہے جو دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے۔ مصنف نے **تفہیم القرآن** کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں ایک طویل فہرست ان کی کتابوں اور تصانیف کی شامل کی گئی ہے۔

اس کتاب کے عنوان کو مد نظر رکھتے ہوئے جتنے بھی محققین اور مصنفین نے مضامین لکھے، ان سب میں یہ قدر مشترک ہے کہ ان تمام شخصیات نے برصغیر میں علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی لحاظ سے بہت خدمات پیش کیں۔ یہ سب شخصیات عالم، فقیہ، مجتہد اور استاد کا درجہ رکھتی ہیں۔

مضامین کے لکھنے کے انداز میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے؛ تقریباً سبھی مقالوں میں محققین نے مضمون کو پانچ یا چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے جس میں زیر موضوع شخصیت کی پیدائش، خاندان، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم، سیاسی کارکردگی، مختلف مناصب اور ملازمتوں، علمی و ادبی خدمات، تصانیف، مقالوں اور تقاریر کو درج کیا گیا ہے۔ ایک اور قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے مصنفین کے احوال بیان کیے ہیں۔ وہ تاریخی اعتبار سے بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام شخصیات نام ور ہیں اور دنیا ان کے کارناموں کو جانتی ہے، لیکن ایک کتاب کی صورت میں سب کا ایک جگہ ذکر قاری کے لیے نہ صرف دل چسپ ہے، بلکہ علمی لحاظ سے بھی سود مند ہے۔

تمام محققین نے بیانیہ طرز تحقیق اختیار کیا ہے۔ کچھ مقامات پر تجزیاتی جائزہ ملتا ہے، لیکن بنیادی طور پر ان شخصیات کی زندگی اور کام کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

خلاصۂ بحث

یہ مقالہ سوانحی ادب سے متعلق ان تصانیف و تراجم پر تبصرہ و تجزیہ سے متعلق تھا جو وقتاً فوقتاً ادارہ تحقیقات اسلامی کی جانب سے شائع ہوتے رہے۔ ان کتب میں ادارے نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں رہنے والی اہم اور نابغۂ روزگار شخصیات کے احوال اور خدمات پر علمی اور تحقیقی بنیادوں پر وقیع کام کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔

ادارہ ہذا نے جن شخصیات کا انتخاب کیا ہے وہ مختلف علوم وفنون اور میادین کے امام اور مقتدا سمجھے جاتے ہیں۔ چناں چہ فقہ کے مجال میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات کو سامنے لایا گیا ہے۔ اسی طرح تاریخ اور فکر کے میدان میں ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیات پر لکھا گیا ہے۔ مزید برآں برصغیر کے نام ور علمی اور سیاسی شخصیات میں سے سید ابو الاعلیٰ مودودی اور عبد اللہ یوسف علی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اسی طرح سیاست کے منفرد نام بانی پاکستان محمد علی جناحؒ کے حالات زندگی کو بھی شائع کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ادارہ تحقیقات اسلامی کا سوانحی ادب کے میدان میں شائع شدہ کتب اور تراجم نہایت مفید اور دل چسپی پر مبنی ہیں اور مختلف شعبوں کے طلبہ ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔